قرآنِ حکیم اور ہماری زِندگی

از

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمن

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ۔ پاکستان

شائع کردہ

صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازا ۔ نشتر روڈ کراچی

اشاعت اول ———— ۱۹۸۱ء

طابع ———— روحانی پرنٹنگ پریس۔ ملتان

ناشر ———— صدیقی ٹرسٹ۔ کراچی

تعداد ———— ایک ہزار ۱۰۰۰

قیمت ———— تیس ۳۰ روپے

فہرست

پیش لفظ

۱۹۶۸ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیانی عرصے میں ریڈیو پاکستان کے مقبول پروگرام "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی" اور دوسرے پروگراموں میں وقتاً فوقتاً میری جو تقریریں نشر ہوئیں ان کی تعداد کئی سو تک پہنچ گئی ہے۔ عرصہ سے میری خواہش تھی کہ یہ تقریریں چھپ جائیں تو اچھا ہے تاکہ ان کا افادہ جاری رہے۔ لیکن دوسری مصروفیتوں نے ان کو مرتب کرنے کی مہلت نہ دی۔

حسنِ اتفاق سے صدیقی ٹرسٹ، کراچی کے صدر جناب محمد منصور الزمان صاحب صدیقی نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ میری ان تقریروں کو کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اب کچھ نہ کچھ وقت نکال کر اپنی ان تقریروں کو مرتب کرنا میرے لئے ضروری ہوگیا۔

اس طرح ان تقریروں کا پہلا حصہ تیار ہوگیا جو کتابی صورت میں محمد منصور الزمان صاحب اور منشی عبدالرحمٰن خان صاحب کی کوشش سے صدیقی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مقصد کو جو ان تقریروں سے وابستہ ہے، پورا فرمائے آمین۔ ثم آمین۔

۸ر جولائی ۱۹۸۱ء

ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

احترامِ قرآن پاک

قرآن پاک ہم مسلمانوں کی مقدس ترین کتاب ہے۔ اس کا احترام ہر مسلمان پر فرض ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں قرآن پاک کو شعائر اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ جس کی تعظیم قلب میں پاکیزگی پیدا کرتی ہے۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی سلطنت کا بادشاہ اپنے کسی سفیر کی معرفت اپنا کوئی فرمان اپنے کسی نائب کو بھیجتا ہے تو وہ نائب اس سفیر کا استقبال کرتا ہے۔ اور اس کے فرمان کو انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ وصول کرتا ہے —— پھر قرآن پاک، جو احکم الحاکمین کا ابدی فرمان ہے۔ تمام عالم انسانیت کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے، اس کی عزت و توقیر جس قدر بھی کی جائے کم ہے۔

قرآنِ پاک کی عزت و توقیر اور احترام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ذہنی یا روحانی اور دوسری ظاہری —— قرآنِ پاک کا سب سے بڑا احترام یہ ہے کہ تلاوت کرنے والا یہ یقین کرے کہ وہ اللہ کا کلام پڑھ رہا ہے اور سننے والا یکسو ہو کر خاموشی کے ساتھ سنے کہ وہ اللہ کا کلام سُن رہا ہے۔ یہ ذہنی یا روحانی ادب ہے۔ ظاہری ادب یہ ہے کہ پاک صاف ہو کر اور باوضو ہو کر قرآنِ پاک کو ہاتھ لگائے۔ نیز قرآن پاک کا ظاہری ادب یہ بھی ہے کہ اس کے اوراق یا اجزاء کو اِدھر اُدھر منتشر نہ کرے، زمین پر، سڑکوں پر، راستوں پر نہ پھینکے اور اگر کہیں پا جائے تو اٹھالے، خواہ وہ قرآنِ پاک کا کوئی پھٹا پرانا ورق ہو یا کاغذ پر لکھی ہوئی کوئی آیت ہو یا اللہ کا نام۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم احترام قرآن پاک کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس کا سبب خدا نخواستہ یہ نہیں کہ ہم کلام اللہ کی عظمت سے ناواقف ہیں، بلکہ اس کا حقیقی سبب ہماری بے توجہی ہے۔ مثلاً ردی فروخت کرتے وقت ہم یہ خیال نہیں کرتے کہ جو پرانے اخبار یا کتابیں ہم ردی پیپر والے کے ہاتھ بیچ رہے ہیں ان میں ایسے صفحات بھی شامل ہیں جن پر قرآنی آیات لکھی ہیں۔ ردی پیپر خریدنے والا عام طور پر زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ لہذا وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے، وہ سارے کا سارا گٹھا دوکاندار کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے اور دوکاندار ان اخبارو اور کتابی کاغذوں کو سودا باندھنے کے کام میں لاتا ہے۔ اس کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ پڑیا باندھتے وقت ایک نظر ڈال لے کہ کہیں کاغذ پر قرآنی آیات تو درج نہیں۔

چنانچہ ہم اخبار پڑھنے والوں کا بھی فرض ہے کہ اخبار میں کوئی قرآنی آیت چھپی ہوئی دیکھ کر اس کو کاٹ کر علیحدہ رکھ دیں اور اکٹھا ہو جانے پر زمین میں دفن کر دیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ دفن کے واسطے اس طرح لحد بنائی جاتے کہ مٹی ڈالنے سے قرآنی آیت پر مٹی نہ پڑے کیونکہ اس میں ایک گونہ تحقیر ہے، بعض لوگ ان اوراق کو جلا ڈالتے ہیں۔ لیکن امام محمد بن الحسن الشیبانی نے اپنی کتاب السیر الکبیر میں اس کی ممانعت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ قرآن پاک اور کتب تفاسیر و احادیث پر کوئی دوسری چیز نہ رکھی جاتے۔ کیونکہ اس سے ان کے احترام میں فرق آتا ہے۔

میں نے بچپن میں دیکھا ہے کہ بڑی بوڑھیاں جہاں کہیں پھٹے پرانے سپارے کا کوئی ورق یا ٹکڑا زمین پر یا کسی غلط جگہ پڑا پاتیں فوراً اس کو اٹھا لیتیں اور ایک جزدان میں رکھ لیتیں اور پھر محلہ کی مسجد میں بھجوا دیتیں، مسجد کا امام یا موذن ان جمع شدہ پھٹے اوراق اور قرآنی آیات کو لے جا کر کہیں دفن یا دریا برد کر آتا۔

آجکل کتابی علم کی بہتات ہے۔ چھاپے خانے روزانہ ہزاروں کی تعداد میں قرآن پاک چھاپ رہے ہیں، اس لئے احترام قرآن کا مسئلہ خاصہ اہم ہو گیا۔

ہے۔ اس کے لئے ہم میں سے ہر شخص کو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ جہاں کہیں بھی نظر پڑ جائے ایسے کاغذ کو اٹھا کر اس میں سے قرآنی آیات کا حصہ الگ محفوظ کر لیں اور پھر فرصت پا کر مسجد میں پہنچا دینا چاہیئے۔ ہر مسجد کے اندر ایک صندوقچہ اسی کام کیلئے رکھا جانا چاہیئے تاکہ لوگ اس میں قرآن پاک کے پھٹے ہوئے بوسیدہ یا منتشر اوراق اور اخبارات کے تراشے (cutting) جن میں قرآنی آیات درج ہوں۔ ان صندوقچوں میں رکھ آئیں اور اکٹھا ہو جانے پر مسجد کے امام یا مؤذن صاحب اس کو مناسب جگہ دفن کر دیں۔

حنفی فقہ کی مشہور و مستند کتاب فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے کہ جس کاغذ پر اللہ کا نام لکھا ہو؛ اس میں کوئی چیز لپیٹ کر باندھنا مکروہ ہے۔ چنانچہ اگر اس کاغذ پر اللہ تعالیٰ کا نام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہو تو لپیٹنے کے واسطے اس نام پاک کا محو کرنا، مٹانا، جائز ہے۔

قرآن پاک، تفسیر یا حدیث یا فقہ کی کتاب کو بطور تکیہ آرام کی غرض سے سر کے نیچے رکھنا منع ہے۔ اسی طرح تکیہ کے غلاف پر اللہ کا نام کاڑھنا بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ وہ آرام کی غرض سے سر کے نیچے استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کی یہ عادت بھی سننے میں آتی ہے کہ وہ صبح کا اخبار لیکر بیت الخلاء میں چلے جاتے ہیں۔ اخبار میں قرآن کی آیت یا اللہ کا نام لکھا ہو تو بیت الخلاء یا کسی اور ناپاک مقام پر لے جانا منع ہے اسی طرح انگوٹھی وغیرہ پر اگر اللہ کا نام کندہ ہو تو اس انگوٹھی کو بھی بیت الخلاء یا پیشاب خانے میں لے جانا مکروہ ہے۔

احترامِ عدل

احترام عدل پر گفتگو کے ساتھ ہی اسلام میں عدل کے مفہوم، عدل کے تقاضے اور وہ ذرائع جن کے بغیر عدل کا حصول ممکن نہیں زیرِ بحث آجاتے ہیں۔

عدل کی تعریف ایک مسلمان فقیہہ نے " وضع الشئ فی محلّہ " کے الفاظ میں بیان کی ہے۔ کہ عدل نام ہے شئے کا اُس کے اپنے مقام پر رکھ دینے کا۔ یعنی ہر امر کا ایک محل ہوتا ہے۔ جس میں اس کو واقع ہونا چاہیئے۔ بس اس امر کا ٹھیک ٹھیک اپنے محل میں واقع ہوجانا عدل ہے۔

عدل کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی دو چیزوں کا برابر ہونا۔ اس کے لئے قرآن حکیم میں عدل، میزان اور قسط کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، ان سب میں برابری کے معنی مشترک ہیں۔

قرآنی اصطلاح میں عدل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عدل مطلق اور دوسری عدل شرعی۔

آیت قرآنی " ان اللہ یامُرکم بالعدل والاحسان " میں خدا ہم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے اور نیکی کے مقابلے میں زیادہ نیکی سے کام لینے کا نام احسان ہے۔ اس عدل و احسان کی تلقین دنیا کے تمام مذاہب نے کی ہے۔ لیکن عدل شرعی جس کو قرآن قائم کرنا چاہتا ہے وہ اسلام کی اپنی خصوصیت ہے جس کی واضح مثالیں قرآن حکیم اور سنتِ نبوی میں بکثرت موجود ہیں۔

اسلام انسانی زندگی میں عدل کے عمومی اور خصوصی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ عمومی پہلو کا مطلب ہے کہ انسان اپنی زندگی کے عمومی دائرے میں عدل و انصاف کا

احترام کرے، اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھے، کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا مرتکب نہ ہو۔ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں انسانی تعلقات کے دائرے میں اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو عدل کے خلاف ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کی دو بیویاں ہوں تو اسے یہ عمومی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کے درمیان نان و نفقہ اور ازدواجی تعلقات میں عدل رکھے۔ اگر دونوں بیویوں سے اولاد ہو تو تمام اولاد کی تعلیم و تربیت اور پرورش و نگرانی اور ان کی جملہ ضروریات کی کفالت میں پورا پورا عدل کرے، اسی طرح باہمی لین دین اور تجارت و اجارہ میں عدل کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھے۔ اس میں حکومت اور افراد معاشرہ کے درمیان ایک عادلانہ نظام بھی داخل ہے۔

عدل کے خصوصی پہلو سے میری مراد وہ عدل ہے جو حکومت کی قائم کردہ عدالتوں کے ذریعے فریقین متنازعین کے درمیان نافذ ہوتا ہے۔ عدل کی ضرورت پوری دنیا میں تسلیم شدہ ہے۔ اگر عدالت ہائے انصاف (courts of Justice) نہ ہوں اور ان کے ذریعے عدل قائم نہ کیا جا سکے یا ان کے قائم کردہ عدل کا احترام نہ کیا جائے تو پوری تہذیب زوال کا شکار ہو کر فنا کے درجے تک پہنچ جائے گی۔ عدل کے قیام و احترام کے لئے عادلانہ قانون، قابل اور صاحب کردار عدلیہ، سچی قیادت اور آئینی طریقوں کا استعمال شرط لازم ہے۔

احترام عدل کے سلسلے میں دنیا کے تمام قوانین میں بالعموم اور قانون قرآنی میں بالخصوص شہادت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ صحیح، سچی اور بے لاگ شہادت کے بغیر کوئی بھی عدالت حقیقی معنی میں عدل نہ کر سکے گی۔ اگر جھوٹی شہادت پیش کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ عدل کے تقاضے مجروح ہوں گے اور ظلم و زیادتی کو کھلی چھٹی مل جائے گی۔

شہادت اہم ترین ذریعۂ عدل ہے۔ جس طرح مقصد عزیز و محترم ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ ذریعہ بھی جو اس مقصود کے حصول کا سبب ہو عزیز اور محترم ہوتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر احترام عدل جو ہمارا مقصود ہے اس کے ساتھ ہی ہمارے لئے

ان تمام ذرائع عدل کا بھی احترام ضروری ہو جاتا ہے جو اگرچہ بذات خود مقصود نہیں ہیں لیکن اصل مقصود کے حصول و کامیابی کا ذریعہ ہیں۔ اس لیۓ دنیا کے ہر نظام عدل ہیں عدالتوں کے احترام کی بھی تلقین کی گئی ہے، کیونکہ وہ عدل کے ایک آلے اور ذریعے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ شہادت کا احترام بھی اسی قدر مطلوب ہونا چاہیئے جس طرح خود عدل کا، کیونکہ سچی شہادت کے بغیر عدل تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اسی لئے قرآن حکیم نے عدل کی حکمرانی کے ساتھ سچی بے لاگ اور غیر جانبدار شہادت پر بڑا زور دیا ہے سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت فرماتا ہے:۔

یا ایّھا الذینَ آمنوا کونوا قوامینَ بالقسطِ شھداءَ للّٰہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیاً او فقیراً، فاللّٰہُ اولیٰ بہما، فلا تتبَعوا الھوٰی ان تعدلوا وان تلوا او تعرضو، فان اللّٰہ کان بما تعملون خبیرا۔

اے مسلمانو! انصاف پر قائم رہو اور خدا سے ڈرتے ہوئے گواہی دو یعنی سچی بات کہو، اگرچہ وہ گواہی خود تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ یا عزیز و اقارب کے خلاف ہو۔ اگرچہ کوئی شخص مالدار یا مفلس ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا تم سے زیادہ نگہبان ہے۔ تم انصاف کو چھوڑ کر اپنے نفس کی خواہش پرمت چلو اگر گواہی میں پیچ ڈالو گے یعنی گھما پھرا کر بات کرو گے اور بچا جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

سورۃ مائدہ کی ایک آیت میں پھر اسی مضمون کو ذرا دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یا ایّھا الذین آمنوا کونوا قوامینَ للّٰہ شھداء بالقسط ولا یجرمنّکم شنآنُ قومٍ علی الّا تعدلوا۔ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ، واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون۔

اے مسلمانو! خدا کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے پر مستعد رہو اور لوگوں کی دشمنی تم کو ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف ہی پرہیزگاری تک پہنچنے کی نزدیک ترین راہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

آجکل ہمارے معاشرہ میں پیشہ ور گواہوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو روپیہ لیکر عدل و انصاف کے تقاضوں کا خون کرتا ہے۔ قرآن حکیم احترام عدل کے تقاضوں کو بجالانے کے ضمن میں ہدایت کرتا ہے کہ گواہی اور انصاف کو نہ بیچو خواہ وہ تمہارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ رشوت اور انصاف کے معاملے میں رشوت اور سفارش بھی احترام عدل کے منافی ہے۔

آج ہمارے معاشرہ میں تمام خرابیوں کی جڑ ظلم و ناانصافی اور احترام عدل کا فقدان ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص حقوق کے حصول اور فرائض کی ادائیگی میں قرآنی عدل کے تقاضوں کا پورا پورا احترام کرے تو یقیناً ہمارا معاشرہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ بن سکتا ہے، جہاں ہر شخص آزادی، امن، عافیت اور خوشحالی کی دولت سے بہرہ ور ہو۔

اسلام میں علم کا مقصد

علم کا مقصد بیان کرنے سے پہلے ہم علم کے معنی متعین کر لیں کہ علم سے ہماری مراد کیا ہے۔ علم کی معروف تعریف یہ کی گئی ہے کہ "حقائق اشیاء کے جاننے کا نام علم ہے۔" اس ضمن میں علمائے اسلام نے علم کی دو قسمیں کی ہیں۔ **اول** یہ کہ علم "منزل من اللہ" ہو یعنی وحی الٰہی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہو اس کو تو وہ علم کہتے ہیں اور وہ علم جو عقلِ انسانی کی پیداوار ہو اس کو وہ صنعت کہتے ہیں۔ پہلی قسم میں قرآن و حدیث ان کے نزدیک حقیقی معنی میں علم ہے۔ فقہ بھی اس میں داخل ہے۔ کیونکہ "قرآن و حدیث کی رو سے شریعت کے احکام بالتفصیل جاننے کا نام فقہ ہے۔ **دوسری** قسم میں جغرافیہ، ریاضی، سائنس، منطق و فلسفہ آتے ہیں جن کو علمائے اسلام صنائع سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بحث میں جائے بغیر کہ یہ تقسیم و تفریق درست ہے یا نہیں، یہاں علم سے ہماری مراد اس کے وسیع معنی میں "حقائق کا جاننا" ہے، خواہ وہ وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہو یا عقلِ انسانی کے ذریعہ، خواہ وہ خالصتاً دینی ہو یا دنیاوی۔ اس لئے کہ علم کا دنیاوی یا دینی ہونا مقصدیت کے لحاظ سے اعتباری ہے۔ اگر آپ سائنس و انجنیئرنگ اس لئے پڑھیں کہ لڑاکا ہوائی جہاز بنا کر اسلامی مملکت کا دفاع کریں گے تو آپ کی یہ ساری تعلیم "عبادت" شمار ہوگی اور آپ کا تحصیل علم کا یہ فعل ایک دینی فعل قرار پائے گا۔ اور اگر آپ قرآن و حدیث کا علم اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ آپ اس کے ذریعہ سے دنیا کمائیں گے تو آپ کی یہ ساری کاوش کسبِ معاش کہلائے گی۔

اس مختصر سی بحث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ تحصیل علم کے سلسلے

میں بنیادی بات مقصد کی ہے، نصب العین کی ہے۔ اسلام تحصیل علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے فرض قرار دیتا ہے، " طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ"۔ یہاں ایک بات یہ عرض کرتا چلوں کہ اس حدیث میں تحصیل علم کو فرض قرار دیا گیا ہے، حق نہیں کہا گیا، حق سے آدمی دست بردار بھی ہو سکتا ہے۔ فرض سے دست برداری ممکن نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے، اقوام متحدہ میں جو حقوقِ انسانی کا منشور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر ایک کا حق ہے، اسلام علم کو فرض قرار دے کر اس کی اہمیت کو اور بڑھاتا ہے۔

جہاں تک مقصد کا تعلق ہے قرآن پاک علم کا اولین مقصد معرفت خداوندی قرار دیتا ہے۔ علم کے بغیر خدا کے وجود کا اقرار بھی ممکن نہیں۔ علم کے ذریعے اپنی خواہشوں پر عمل نہیں کیا جاتا بلکہ علم کے تقاضوں کے بموجب عمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے : " ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءک من العلم " کہ آپؐ ہرگز اتباع نہ فرمائیں۔ اُن کی خواہشات کا، اس کے بعد کہ آپؐ کے پاس علم آ گیا۔

علم کا اہم ترین مقصد عدل پر قائم رہنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے : " واولوا العلم قائماً بالقسط " کہ صاحبان علم عدل و انصاف پر قائم رہتے ہیں۔ سورۂ حدید میں بعثت رسل اور نزول کتب سماوی کا مقصد بھی عدل و انصاف کا قیام بتلایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

" لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط "

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اصحاب علم کے حق میں ارشاد قرآنی " انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء " کہ علماء ہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ علم اور اہلِ علم کی فضیلت کے بارے میں نص ہے۔ بالواسطہ

طور پر کتاب الہٰی جو علم کا یقینی ذریعہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو انصاف پر قائم رکھنا ہے۔ کیونکہ جو معاشرہ انصاف پر قائم ہوتا ہے۔ وہی صحیح معنی میں انسانی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور ساتھ ہی انسانیت کی بقا اور ترقی کا ضامن بھی۔

ظاہر ہے کہ لوگوں کو عدل و انصاف پر قائم رکھنے کے لئے قوت و شوکت اور غلبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے علم کے مقاصد میں توحید و معرفت الہٰی کے بعد معاشرے میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے ان تمام وسائل علم کا اختیار کرنا لازم آتا ہے جو قوت و شوکت اور غلبے کا موجب ہوں۔ اس میں فنون جنگ میں مہارت اور سائنسی آلات کی تیاری سب شامل ہیں۔ سورۂ ہود میں حضرت نوحؑ کو باری تعالیٰ کا یہ ارشاد " واصنع الفلک باعیننا " اس بارے میں نص ہے۔

قرآن پاک صرف علم کی بنا پر انسان کو مسجود ملائکہ بناتا ہے۔ گویا انسان کی وجہ فضیلت ملائکہ کے مقابلے میں صرف علم ہے۔ اور نبیوں اور دوسرے انسانوں کے درمیان بھی وجہ فضیلت علم ہی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

" ولقد اٰتینا داؤد وسلیمان علماً وقالا الحمد للّٰہ الذی فضّلنا علیٰ کثیر من عبادہ المؤمنین "

قرآن حکیم علم کو دولت پر فضیلت بخشتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص میں جہاں قارون کا ذکر آتا ہے کہ لوگ اس کے بے اندازہ مال و دولت کو دیکھ کر خواہش کرنے لگے کہ کاش ان کو بھی ایسا ہی مال و دولت نصیب ہو جاتا، تو قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

" قال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللّٰہ خیر لمن آمن و عمل صالحاً "

قارون کی دولت اہل علم کی نگاہوں میں ہیچ ہے جو ایمان لایا اور نیک عمل کئے اس کے لئے اللہ جل شانہ کی طرف سے جو ثواب ملتا ہے وہ قارون کے خزانے سے بہت بہتر ہے۔

" یرفع اللّٰہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات "

جو لوگ ایمان لائے ان کو اللہ بلندی عطا کرتے ہیں، اور صاحبان علم کے لئے کئی درجے ہیں۔ قرآن پاک اہلِ علم کے تعلق سے جس علم کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد انسان کو نیک اور باخدا بنانا ہے کہ وہ علم کے ذریعہ خدا تک پہنچے اور معاملات میں وہ ایک نیک اور مثالی انسان بنے تاکہ اپنی زندگی کو نوع انسان کی بہتری کے لئے با مقصد بنائے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک جس شئے کو علم کہتے ہیں اس کا مقصد آدمی کو انسان اور انسان کو اعلیٰ انسان بنانا ہے۔

آج کی دنیا میں حال یہ ہے کہ علم کو مقصد معاش انسانی کی جدوجہد کا ایک سودمند اور کامیاب ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور نفع اندوزی کی اس سنگ دلی نے خدمت اور نیکی کے سب دروازے بند کر دیئے اور انسان سے اس کی انسانیت چھین لی ہے۔ نیکی کا حصول تو غایت تعلیم سے کوئی خارجی چیز معلوم ہوتا ہے اور حقیقت میں موجودہ علم اور تعلیمی نظام ہمیں اس سے زائد دے بھی نہیں سکتا۔

ضرورت ہے کہ اسلام میں علم کے اعلیٰ مقصد کے پیش نظر ہم اپنے تعلیمی نصاب اور سرگرمیوں کو اسلام کے تابع رکھیں اور ایسی پالیسیاں بنائیں جن پر عمل کر کے ہم اچھے عالم، اچھے صنّاع اور اچھے انسان پیدا کر سکیں۔

اسلام میں قصاص کی سزا

قصاص کے سلسلے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے "ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص" یعنی جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر ہے۔ یہی حکم یہودیوں کو تورات میں دیا گیا تھا، البتہ شریعت یہودیہ میں قصاص معاف کر دینے کا اختیار نہ تھا۔

قصاص کی سزا اپنے اطلاق میں گو عام ہے مگر قصاص اس شخص کے مار ڈالنے سے واجب ہوتا ہے، جو واجب القتل نہ ہو، معصوم الدم ہو، بشرطیکہ اس کو قصداً مار ڈالا جائے یعنی قصاص قتل عمد کی صورت میں واجب ہوتا ہے۔ قصاص میں دو حق جمع ہو گئے ہیں ایک خدا کا حق کیونکہ اس سے معاشرے سے فساد دفع ہوتا ہے اور دوسرا بندے کا حق کہ اس سے مقتول کے ورثار کو طمانیت قلب حاصل ہوتی ہے لیکن اس میں بندے کا حق غالب ہے۔ اسی لئے بندے کو اپنا حق قصاص معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

قصاص کی سزا کا اطلاق ان تمام جسمانی جرائم پر بھی کیا جاتا ہے جو قتل سے کم درجے کے ہیں مثلاً کسی عضو جسمانی کو قطع کر دینا یا اس کے معنی مقصود کو ضائع کر دینا، سر اور چہرے کو زخمی کر دینا یا دیگر اعضاء جسم کو مجروح کر دینا۔ مثلاً ہاتھ، پاؤں انگلیاں، ناخن، کان، ناک، عضو تناسل، خصیے، ہونٹ کاٹنا، آنکھ نکال دینا،

یا آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی قوتوں اور اوصاف کو زائل کر دینا یا جسم انسانی کو ضربات یا زخم پہنچانا، ان سب میں قصاص ہے جس کی تمام تر جزئیات اسلامی کتب فقہ میں تفصیلی طور پر مذکور ہیں۔

اور اس امر میں تمام آئمہ اہل سنت، ظاہریہ، اور شیعہ جعفریہ کا اتفاق ہے کہ قتل عمد کے مرتکب سے جبکہ وہ کسی اپنے ہم مثل آزاد شخص کو ظلماً اور ارادتاً قتل کرے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بشرطیکہ قاتل مقتول کا باپ نہ ہو۔

اسی طرح ائمہ اہل سنت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ کافر سے جو مسلمان کا قاتل ہو قصاص لیا جائے گا۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ بیٹا اگر باپ کو قتل کرے تو اس سے بھی قصاص لیا جائے گا۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو ایسا مجروح کر دے کہ جس کے سبب مجروح کی موت واقع ہو جائے تو اس میں بھی قصاص ہوگا، اس مسئلے میں بھی اتفاق ہے کہ جب مقتول کے ورثاء قصاص معاف کر دیں تو اب قاتل کے خاندان پر دیّت (خون بہا) واجب ہو گی۔

اسٹاک ہوم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے زیر اہتمام منعقدہ حالیہ کانفرنس (دسمبر ۱۹۷۷ء) میں سزائے موت کے خلاف عالمی سطح پر مہم چلانے کا اعلان کیا گیا ہے اور اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں مداخلت کرے اور اس غیر انسانی سزا کو ختم کرائے۔ گویا کانفرنس کی رائے میں کسی انسان کا دوسرے انسان کو ظلماً قتل کر دینا تو غیر انسانی نہیں مگر اس قتل کے بدلے اس کو عدالت انصاف کا سزائے موت (قصاص) کا حکم دینا غیر انسانی ہے۔ بر این عقل و دانش بباید گریست۔

بعض جدید ماہرین قانون نے بھی اسلامی حکم قصاص پر اعتراضات کئے ہیں، ان ماہرین قانون نے انفرادی و شخصی حق کو جماعتی (معاشرتی) حق کے مقابلے میں فوقیت دی ہے اور اس سزا کو ایک انتقامی فعل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سرا سر ظلم ہے اور اس سے مجرم کی اصلاح ہرگز نہیں ہو سکتی لیکن انتقام اور قصاص میں فرق ہے۔ پہلا فرق یہ ہے کہ انتقام کی صورت میں مساوات نہیں ہوتی اور اس میں مجرم کے ساتھ غیر مجرم بھی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ جبکہ قصاص میں جرم اور سزا کے درمیان

مساوات پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر جس محل پر مساوات ممکن نہ ہو تو قصاص کی سزا سے اجتناب کیا جاتا ہے اور کوئی دوسری مناسب سزا تجویز کی جاتی ہے۔ انتقام اور قصاص میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انتقام کا سلسلہ بالعموم قوی اور ضعیف کے درمیان ہوتا ہے، جبکہ قصاص بہ حکم حاکم وجود میں آتا ہے جس میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہوتی، بلکہ پوری جماعت کے افراد پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کریں۔ حتیٰ کہ قصاص کا اجراء ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم لوگ معروف کا حکم دیتے رہنا، برائی سے منع کرتے رہنا، ظالم کا ہاتھ پکڑ لینا اور حق پر خوب ڈٹے رہنا، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں سے باہم محبت و تعلق اٹھالے گا، پھر تم دعا کرو گے مگر وہ قبول نہ ہوگی"۔

قصاص کے ذریعہ اس شخص کی قلبی تکلیف کا مداوا مقصود ہوتا ہے جس پر جرم کے ارتکاب سے زیادتی کی گئی ہے۔ دراصل قصاص مظلوم اور اس کے اہل خاندان کی قوت غضبی سے پیدا ہونے والے مابعد اثرات سے معاشرے کو محفوظ و مامون رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

مثال کے طور پر جس شخص کی آنکھ پھوڑی گئی ہو اس کی سوزش قلبی کا مداوا ملزم کو دی جانے والی چند سال قید بامشقت یا جرمانے سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے قلب کو اسی وقت تسکین ہوگی جب اس مجرم کی بھی آنکھ پھوڑ دی جائے۔ الغرض ایک طرف آنکھ پھوڑنے والا اچھی طرح یہ سمجھے گا کہ قصاص میں اس کی آنکھ بھی پھوڑی جائے گی اور قصاص کی اس سزا کے خوف سے وہ اس جرم سے باز رہے گا۔ دوسرے یہ کہ مظلوم اور اس کے اہل خاندان کو بھی صبر آجائے گا۔ قصاص کی سزا نہ ہونے سے، خبر نہیں، مجرم کے دیگر اہل خاندان کو ناکردہ گناہ کس کس خطرے کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح ایک شخص کو مجمع عام میں طمانچہ مارا گیا، مضروب کے دل کو اسی وقت چین نصیب ہوگا۔

جب وہ بھی ضارب کے مجمع عام میں طمانچہ مارے ۔ ورنہ ضارب کو چند یوم یا چند ماہ قید سادہ یا جرمانہ کی سزا اس اذیت کا صحیح بدل نہیں ہو سکتی جو مضروب کو پہنچی ۔

قانون مساوات (عدل) یہ امر واجب قرار دیتا ہے کہ جرم اور سزا میں مکمل مساوات ہو اور جو اذیت مظلوم یا مجروح کو ضارب یا جارح سے پہنچی ہے ، اتنی اور اسی طرح کی اذیت مجرم کو بھی پہنچائی جائے تاکہ مجرم نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ صحیح معنی میں پائے ۔ ظلم کی ابتدا کرنے والا سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے اور اس کے ظلم کی جوابی کارروائی بہ صورت قصاص کو ہرگز ظلم نہیں کہا جا سکتا بلکہ مجرم کو بغیر قصاص کے چھوڑ دینا سب سے بڑا ظلم ہوگا ۔

یہ امر عین فطرت کے مطابق ہے کہ قصاص کے بعد مظلوم کے ذہن میں انتقام یا مجرم کے ساتھ زیادتی کرنے کا تصور ہی نہ پیدا ہوگا ۔ کیونکہ اس کا قلب قصاص کے بعد مطمئن ہو جائے گا ۔ چونکہ قصاص کا مقصود معاشرے سے ظلم کا استیصال اور مظلوم اور اس کے اہل خاندان کی تسکین قلب کا حصول ہے ۔ اسی لئے شریعت نے حتی الامکان سزا میں مظلوم کی تشفی قلب کا لحاظ رکھا ہے ۔ اسی لئے اگر قصاص میں مکمل مساوات ممکن نہ ہو تو مظلوم اور اس کے اہل خاندان کو مجرم سے معاوضہ دلانا بہ منزلہ سزا سمجھا گیا ہے ۔ پھر اگر قصاص ممکن نہ ہونے یا معاف کر دینے کی بنا پر ساقط ہو چکا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کسی قسم کی جسمانی سزا ہی نہ دی جائے بلکہ اس حالت میں معاشرے کا حق مجرم سے متعلق رہتا ہے اور حاکم مجاز کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھی تعزیری سزا تجویز کرے تاکہ خدا کی زمین میں فساد نہ پیدا ہو اور مفسدوں کو فساد برپا کرنے کی جرأت نہ ہو سکے ۔

قصاص کی سزا زخموں یا ضربات کے علاوہ قتل کے جرم میں سختی کے ساتھ نافذ کی جاتی ہے تاکہ کسی معصوم جان کا خون ضائع نہ ہونے پائے ۔ لیکن اگر کسی سبب سے قصاص کی سزا نافذ کی جا سکتی ہو تو مظلوم و مقتول کے اہل خاندان کو اس

کا مالی معاوضہ دیت (خون بہا) کی شکل میں دلوا دیا جاتا ہے تاکہ قاتل کے لئے ایک سبق ہو اور یہ دیت اسی وقت ادا کی جاتی ہے۔ جبکہ قصاص سے کوئی امر مانع پیش آگیا ہو۔ مثال کے طور پر قتل خطاء "واقع ہوا ہو، یا مجرم روپوش ہو گیا ہو اور اس کا پتہ نہ چل سکا ہو اور اگر قاتل کے پاس دیت کی ادائی کے لئے مال موجود نہیں تو اس کے عصبی اقارب (خاندان یا قبیلے) کے ذمہ دیت کا بار ڈالا جائے گا۔ جس کو شرعی اصطلاح میں "عاقلہ" کہا جاتا ہے۔ اور اگر عصبی اقارب موجود نہ ہوں یا موجود تو ہوں مگر تنگ دست و مفلس ہوں تو مظلوم یا مقتول کے اہل خاندان کو بیت المال (سرکاری خزانے) سے دیت ادا کی جائے گی تاکہ مقتول کا خون کسی صورت میں بھی ضائع نہ جانے دیا جائے اور مجروحین کے قلب مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ اسلام کی پوری تاریخ جرم و سزا میں ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ قتل عمد کے عوض قاتل کو محض قید کی سزا دی گئی ہو اور مقتول کے خون کا ضائع ہو جانا گوارا کر لیا گیا ہو۔

مزید برآں حکومت، پولیس اور عدالتی افسران پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی ہے۔ کہ وہ مجرم کی تلاش میں مقدور بھر کوشش کریں۔ حتیٰ کہ اس کو بر سرِ عام لے آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کماحقہ تلاش و جستجو کی جائے اور مجرم کا پتہ نہ چل سکے، لیکن اس کے باوجود بھی اگر قاتل کا پتہ نہ چل سکے تو اہل محلہ میں سے عادل، ثقہ اور صادق القول پچاس افراد پر قسامت واجب ہو گی اور یہ لوگ فرداً فرداً حلف اٹھائیں گے کہ نہ انہوں نے خود مقتول کو قتل کیا اور نہ مقتول کے قاتل سے واقف ہیں۔ قسامت کا عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی مقتول کے سلسلے میں اختیار فرمایا تھا۔

اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ قسامت کا طریقہ اختیار کرنے سے قاتل کا نام معلوم ہو گیا ہے اور اس کا پتہ چل گیا ہے لیکن اگر اس کے باوجود قاتل کا پتہ نہ چل سکے تو اب مقتول کی دیت (خون بہا) حکومت کے سرکاری خزانے پر واجب ہو گی جو در اصل حکومت کی اس تقصیر کی سزا ہے کہ وہ قاتل کا پتہ چلانے میں ناکام

رہی ہے۔ اس ضمن میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز نہیں۔ قسامت کا عمل ہر اس شخص کے لئے اختیار کیا جائے گا جو اسلامی حکومت کے زیرِ عاطفت ہے اور جس کی جان و مال کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہے۔

جن ممالک میں موت کا بدلہ موت نہیں، وہاں انتقاماً ایک قتل کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا قتل واقع ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم کے بدلے غیر مجرم اور اس کے اہل خاندان تک کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح معاشرے میں موت کا بازار گرم رہتا ہے اور بدلہ لینے کا سلسلہ وراثت در وراثت چلتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے "ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب"۔ قصاص کے بارے میں صریح نص ہے کہ اے عقل مندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ قصاص کے خوف سے ایک انسان دوسرے انسان کی جان لینے سے گریز کرے گا اور یہ کہ معاشرے کے لئے "حیات انسانی" کی عام حفاظت کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوگا۔

رائج مسلک یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں کے احکام پر عمل کرنا ہم پر اس وقت ضروری ہے جبکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انکو بغیر نکیر کے بطور حکایت بیان فرمائیں، یعنی اگر کسی حکم کو اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں دوبارہ بیان نہ فرمائیں بلکہ وہ حکم محض تورات و انجیل میں پایا جائے تو اس پر عمل کرنا ہم پر ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل میں بہت ساری تحریفات کرلی ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کے تحت بہت سی باتیں ان میں داخل کر دی ہیں۔ اس لیے موجودہ تورات و انجیل میں مذکور کسی حکم کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ علی ہذا القیاس اللہ تعالیٰ ان کی کسی بات کو دوبارہ بیان فرما کر اگر ہم کو اس پر عمل کرنے سے منع فرمادیں، صراحتاً مثلاً کہ "تم ایسا نہ کرو" یا دلالتاً جیسے مثلاً یوں فرمائیں کہ "ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر یہ حکم نازل ہوا تھا" تو ایسے بیان کے بعد ہمارے

لئے اس پر عمل کرنا حرام اور ممنوع ہے۔ یہ تفصیل لائحہ عمل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بہت بڑا ضابطہ ہے جس سے بہت سارے فقہی احکام نکلتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں بیان کردہ حکم کہ "لکھ دیا ہم نے ان (یہود) پر تورات میں کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ان کے برابر۔ یہ سب احکام مذہب اسلام میں بھی باقی ہیں کیونکہ ان احکام کا ذکر قرآن مجید میں بلا اعتراض بیان فرمایا گیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل وضاحت ہے کہ سابقہ شریعتوں کے جو احکام ہم پر لازم ہوں گے وہ اس بنا پر نہ ہوں گے کہ وہ پچھلے انبیاء کی شریعت میں سے ہیں بلکہ وہ محض اس بنا پر ہم پر لازم ہوں گے کہ وہ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں سے ہیں کیونکہ جب ان احکام کا ذکر ہماری کتاب قرآن مجید میں بغیر نکیر کے کیا گیا تو وہ ہماری شریعت کا حکم بن کر ہمارے دین کا جزو بن گیا اور اب وہ ہمارے اعتقاد و عمل کے اعتبار سے علی حالہٖ شریعت سابقہ کا حکم نہ رہا۔

علم القانون کی غرض و غایت انسان کے ان اعمال کی تنظیم ہے جن کے اختیار کرنے کے بعد وہ سعادت کا درجہ حاصل کر لے۔ چونکہ انسان کی شخصی سیرت و کردار پر قانون کو براہِ راست تسلط حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ انسانی سیرت و کردار کی تشکیل میں صرف اسی صورت میں مؤثر ہو سکتا ہے کہ قانون کی خلاف ورزی پر مؤثر سزا دی جائے۔ ظاہر ہے کہ "سزا" ضرر کا نام ہے لیکن یہ "ضرر" جو اس شخص کو پہنچایا جاتا ہے ایک تو اس ضرر کا بدلہ ہوتا ہے جو اس شخص کے ہاتھوں دوسرے کو پہنچا، دوسرے وہ ضرر جو مجرم کو جرم کی سزا کے طور پر پہنچایا جائے گا، معاشرے کے حق میں منفعت ہوتا ہے۔ قوانین کا نفاذ جس سے نفس انسانی میں خوف پیدا ہو، اذیت کا احساس لاحق ہو اور قانون کا رعب دلوں پر جم جائے۔ بالآخر اس خوف و اذیت سے نجات دلانا ہوتا ہے جو ایک جابر شخص دوسرے شخص

کو اپنے مجرمانہ اور ظالمانہ فعل سے پہنچاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قانون جس مقصد کے حصول کے لئے وضع کیا جاتا ہے ۔ وہ صرف اس کے نفاذ سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ قانون کے ذریعہ جو سزا دی جاتی ہے وہ مادّی ہونے کے سبب مجرم کے جسم و مال و آزادی پر مرتب ہوتی ہے اور اگر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تعزیری قوانین کی بنیاد عدل پر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک شخص انسان کے جسم و جان پر ظلم کرنے والا خود ابھی سزا کا مستحق نہ ہو جو اس نے دوسرے کو پہنچائی ، پھر آخر جرم و سزا میں کس طرح مماثلت اور مساوات پیدا کی جائے گی اور عدل کی ترازو کو کیوں کر برابر رکھا جائے گا ؟

اسلام میں عبادت کا تصور

دین اسلام کے پانچ عناصر یا پانچ اجزاء یا یوں کہنا چاہیے کہ اس کے پانچ شعبے ہیں (۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) معاشرت اور (۵) اخلاقیات کسی بھی مذہب یا نظام کی بنیاد اس کے عقیدے یا فکر پر ہوتی ہے۔ دراصل ایک مذہب یا نظام اپنے عقیدے کی ہمہ گیری اور فکر کی گہرائی اور گیرائی سے پہچانا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں بھی جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس کا عقیدہ یا وہ فطری اساس ہے جس پر وہ قائم ہے یا جس کی وہ تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ عقیدے کے لحاظ سے اسلام توحید، رسالت اور آخرت سے عبارت ہے۔ یعنی اس کا عقیدۂ توحید، اس کا عقیدۂ رسالت اور اس کا عقیدۂ آخرت۔ ایک مسلمان کا عقیدہ جب درست ہو اور صحیح ہو اور اسلام کی بنیادی فکر کے مطابق ہو تو پھر عبادات کا نمبر آتا ہے۔ کیونکہ اس کی عبادات دراصل اسی عقیدے اور فکر ہی کا ایک پرتو اور عکس ہوتی ہیں۔

عبادت ایک فطری جذبہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش سے اس کائنات کی ابتداء ہی سے معبود کی تلاش میں ہے۔ کبھی اس نے مظاہر قدرت کو لائق پرستش جانا تو کبھی اپنے ہی ہاتھ کے تراشیدہ بتوں کو خدا مان کر پرستش شروع کی۔ تاریخ مذاہب ہمیں بتاتی ہے کہ داعیان مذہب نے انسان کو توحید کی طرف بلایا۔ اسلام بھی توحید کا سب سے بڑا داعی اور سب سے بڑا مبلغ بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ اور توحید کا تصور دیا، عقیدہ دیا اور اس کو تمام آلائشوں اور توہمات سے پاک کیا۔

عبادت کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم واحترام کی وجہ سے اس کی انتہائی عزت اور اپنی انتہائی عاجزی، اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار۔ عبادت اپنے اصطلاحی معنی میں خالق و مخلوق کے درمیان تعلق اور رشتے کو ظاہر کرتی ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے: "وماخلقت الجن والانس الاّ لیعبدون" کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہاں عبادت کا مفہوم محض نماز و روزہ نہیں بلکہ انسان کی ساری زندگی جو وہ احکام الٰہی کے مطابق گزارے، عبادت کے مفہوم میں داخل ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے عبادت کی دس قسمیں بیان کی ہیں:-

(۱) نماز (۲) زکواۃ (۳) روزہ (۴) حج (۵) تلاوت قرآن۔

(۶) ہر حالت میں اللہ کا ذکر۔ (۷) حلال روزی کی کوشش۔

(۸) مسلمانوں، پڑوسیوں اور ساتھیوں کے حقوق کی ادائیگی

(۹) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی لوگوں کو نیک کاموں کی فہمائش اور بُرے کاموں سے ممانعت، اور

(۱۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ کی پیروی اور اتباع۔

عبادت کی ان قسموں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عبادت صرف نماز اور روزے کا نام نہیں بلکہ اسلامی عبادت کا تصور دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ اگر ایک طرف عبادت ان طریقوں اور آداب کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ کی شان کبریائی اور بندے کی عبدیت کے اظہار کے لئے متعین ہیں تو دوسری طرف کسب حلال اور حقوق العباد کی ادائی بھی عبادت کے مفہوم میں داخل ہے جو روزمرہ زندگی سے متعلق ہے۔

اسلام نے عبادتوں میں فرض، واجب، سنت اور نفل یا مستحب کی درجہ بندی کر کے عبادات کا ایک جامع، مربوط اور متوازن نظام پیش کیا ہے اور فرض عبادات کا درجہ ان میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور ان کی ادائیگی ناگزیر قرار دی گئی ہے۔

عبادات میں سب سے پہلا درجہ نماز کا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو معراج المومنین اور نور ایمان فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ نماز کفر اور ایمان میں امتیاز کرنے والی ہے۔ قرآن پاک میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے اور کہا گیا ہے کہ نماز فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ "ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر"
شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے کہ اللہ کو نماز میں حالت قیام یعنی کھڑے ہونے کی حالت سب سے زیادہ پسند ہے۔ جبکہ اس کا بندہ انتہائی عجز وانکسار کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہے اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے۔ نماز سے قلب میں خشیت پیدا ہوتی ہے۔
نماز کے ساتھ ہی قرآن پاک میں "زکوٰۃ" کا حکم ہے بلکہ اکثر مقامات پر یہ دونوں حکم قرآن پاک میں ساتھ ساتھ آئے ہیں "اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ" یعنی نماز قائم کرو اور زکواۃ ادا کرتے رہو، کہ صرف نماز کے ذریعے جسمانی عبادت ہی نہیں بلکہ مالی عبادت بھی کرو۔ زکواۃ کا حکم اپنے اندر تعبدی پہلو کے ساتھ ساتھ مسلمان معاشرے کی فلاح وبہبود کے نقطۂ نظر کو بھی لئے ہوتے ہے۔ اسی لئے اس کو "وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم بھی فرمایا گیا ہے۔
اور "روزہ" تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ ہے۔ "کتب علیکم الصیام"، کہ تم پر روزے فرض کئے گئے والی آیت کا اختتام "لعلکم تتقون" پر ہوتا ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ، پرہیزگار بن جاؤ۔ اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔ گویا روزہ تزکیہ نفس کا ایک مستقل نصاب ہے۔ اصلاح نفس کا ایک معین ضابطہ ہے جو ایک مخصوص ماہ یعنی رمضان میں ہر سال ہر بالغ صحت مند مرد وعورت پر فرض کیا گیا ہے۔
اور حج بیت اللہ، اللہ کے دربار میں حاضری کا اذن عام ہے۔ اس میں مساوات اور اسلامی اخوت کی بہترین عملی تعلیم اور ملت اسلامیہ کی اجتماعی قوت کا عملی مظہر بھی ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کی ایک دوسرے سے واقفیت، بھائی چارگی اور باہمی تعاون کی نئی راہوں کے تلاش کرنے میں ممد

اور معاون بھی۔

تلاوت کلام پاک سے قلب انسانی سے گناہوں کا زنگ دور ہوتا ہے۔ اس کی تلاوت صیقل کا کام کرتی ہے۔ جس طرح آئینے پر زنگ لگ جاتے تو اس کو صیقل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قلب مسلم پر گناہوں کی سیاہی جم جاتے تو تلاوتِ کلام پاک صیقل کا کام کرتی ہے۔ اور اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا نہ صرف موجب خیر و برکت ہے بلکہ ذریعہ نجات بھی۔

اور ہر حالت میں اللہ کے ذکر سے زبان و قلب اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور انسان گناہوں سے بچا رہتا ہے۔ جب انسان کی زبان پر اللہ کا ورد جاری ہونے لگتا ہے تو پھر بلا قصد و ارادہ ہر وقت اللہ اللہ کرتا رہتا ہے اور ایک ایسی شادمانی اور سکون و اطمینان کی کیفیت اس کے قلب کو حاصل ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی کسی پریشانی سے نہیں گھبراتا۔ قرآن اعلان کرتا ہے "الا بذکراللہ تطمئن القلوب" کہ قلب انسانی اللہ ہی کے ذکر سے طمانیت اور سکون حاصل کرتے ہیں۔

اسلام کے تصور عبادت میں محض "نماز"، "زکوٰۃ"، "حج" اور "تلاوت قرآن" اور "ذکر اللہ" ہی عبادات شمار نہیں کی گئیں بلکہ "حلال روزی" کی سعی و کوشش اور حلال ذریعے سے تلاش معاش بجائے خود ایک عظیم عبادت قرار دی گئی ہے۔ جو لوگ حرام ذریعے سے روزی کماتے ہیں اور لقمہ حرام کھاتے ہیں۔ ان کی ظاہری عبادتوں کو بے اثر اور بے نتیجہ اور غیر نافع قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق ایک انسان خود اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے جائز اور حلال کمائی کے حصول میں جو وقت گزرتا ہے اور جو محنت اور سعی و کوشش کرتا ہے وہ عین عبادت ہے اور اللہ کی نگاہ میں محبوب اور مرغوب ہے۔

ساتھ ہی دوسرے مسلمانوں کے حقوق کی ادائی بھی عبادت قرار دی گئی ہے۔ ایک مختصر دائرے میں پڑوسیوں اور ساتھیوں خواہ وہ مسلمان ہوں یا نہ ہوں

ان کے حقوق کی ادائیگی بھی عبادت ہے۔

اور پھر ایک بڑا دائرہ عامۃ المسلمین بلکہ عام انسانوں کے درمیان بھلائی کی تبلیغ اور برائی کی بیخ کنی نہ صرف انسانی فریضہ بلکہ عبادت قرار دیا گیا کہ اس سے اجتماعی طور پر معاشرے میں نیکیاں فروغ پاتی ہیں اور برائیاں ختم ہوتی ہیں۔

اور سب سے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کو عبادت قرار دے کر ہمارے ان تمام افعال و اعمال کو عبادت قرار دے دیا گیا ہے جو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مطابقت میں انجام دیں۔ مثال کے طور پر دائیں ہاتھ سے کھانا پینا، بسم اللہ پڑھ کر ہر کام کرنا، یا تین سانس میں پانی پینا۔ اگر ہم سنت سمجھ کر یہ فعل انجام دیں تو یہ فعل جو اگرچہ عادی امور سے تعلق رکھتے ہوں، ہمارے لئے عبادت، موجب خیر و برکت اور باعث ثواب ہیں۔

اور ان سب کا مقصود اصلی، خالق اور مخلوق کے درمیان جو باہمی رشتہ اور تعلق ہونا چاہئے۔ اس کا ہر دم احساس دلاتے اور اس دنیا میں عدل و انصاف پر مبنی انسانی معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتا ہے کہ لوگ عبادات کے ذریعے اپنے نفسوں کا تزکیہ کریں، تقویٰ اختیار کریں گویا دوسرے لفظوں میں اسلام جہاں عقائد کے ذریعے ذہنی اور فکری نشوونما کرتا ہے۔ وہاں عبادات کی ان مشقوں اور عملی تربیت کے ذریعے اچھے اور صحیح معنی میں انسان کی تخلیق کرتا ہے۔ ایسا انسان جس کا اپنے پالنے والے سے تعلق صحیح ہو اور جو کسی کی حق تلفی نہ کرے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ٹھیک ٹھیک ادا کرتا رہے۔

اسلام اپنے عقائد اور عبادات کے تصور اور نظام کے ذریعے انسانی معاملات اس کی معاشرت اور اس کی اخلاقیات کو سنوارنا چاہتا ہے اور ان کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اسلام کے نظام عبادت، تسبیح و تقدیس، رکوع و سجود اور قنوت کی ظاہری بجاآوری اور ادائیگی کے باوجود معاشرے کے افراد کے درمیان، ان کے معاملات، ان کی معاشرت اور ان کی اخلاقیات پر

وہ اثر مرتب نہیں ہو رہا جس کا وہ عبادتی نظام اور تصور مطالبہ کرتا ہے اور مقتضی ہے تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری عبادتوں میں ضرور کوئی نہ کوئی کھوٹ ہے۔ بظاہر ہم ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے ظاہری طور پر تو عبادات میں اللہ کو اللہ مانا ہو لیکن اپنے دنیاوی معاملات میں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ گھنٹے ان ظاہری عبادات کے لئے مختص کر کے باقی تمام اوقات کو اللہ کی حکمرانی سے آزاد کر لیا ہو۔ یا اللہ کے قانون کی جامع اور مکمل و اکمل کتاب "قرآن مجید" کی ایک دو دفعات پر تو طوعاً و کرھاً عمل کر لیا ہو لیکن باقی کتاب قانون کی دفعات کو نظر انداز کر دیا ہو اور اللہ کی قائم کردہ حدود کو توڑا ہو اور اپنی تمام تر زندگی کو نافرمانی کی نذر کر دیا ہو۔

اگر ایسا ہے تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہم نے اسلامی عبادت کے مفہوم کو نہیں سمجھا۔ اسلام ہم سے تقاضہ کرتا ہے کہ ہماری زندگی "ان صلواتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین" کی عملی تفسیر ہو کہ نماز، قربانی میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے، اور بس۔

اسلام اور عقل

دنیا میں ایک طبقہ پڑھے لکھے لوگوں کا ایسا ہے جو مذہب اسلام کو تنگ و محدود اور اس کے احکام و قوانین کو تکلیف دہ اور بالخصوص اس کی مقرر کردہ سزاؤں کو عقل سے عاری، بہیمانہ اور بے رحمانہ قرار دیتا ہے۔ ان لوگوں کے تأثر کی چند وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مسلمان گزشتہ چند صدیوں سے زندگی کے تقریباً ہر میدان میں مغلوبیت، شکست خوردگی اور تہی دستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اس لیے اپنے جواہر ریزے خود ان کی اپنی نگاہوں میں سنگ ریزے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اس کی دوسری وجہ مغرب کا پھیلایا ہوا پروپگنڈہ کا وہ جال ہے جو اسلام کے خلاف اپنے زہریلے اثرات پھیلانے میں مسلسل کوشاں ہے۔ لیکن اس کی ایک اور بڑی وجہ دنیا میں جدید سماج کی تشکیل اور اس کے تقاضے ہیں، جن کے متعلق اسلام کو یا تو فرسودہ قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے یا اس کے احکام اور قوانین کو عقلیات سے عاری قرار دے کر ناقابل عمل خیال کیا جاتا ہے، ورنہ کم از کم یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اسلام جدید سماجی مسائل کے حل کی طرف کوئی مثبت رہنمائی نہیں کرتا۔ اسلام کے خلاف اس وقت دنیا میں مذہب بے زاری کے پھیلتے ہوئے رجحانات سے بھی اس خیال کو تقویت ملی ہے۔ کیونکہ مذہبی بنیاد پر انسانی زندگی کی تشکیل کا مدعی اگر کوئی مذہب ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس لیے اسلام کے خلاف ہر طرف سے جدید نظریوں اور باطل عقیدوں کے حملوں کی یلغار ہے۔ جن میں ایک بڑا حملہ یا اعتراض یہ ہے کہ اسلام میں عقل کو دخل نہیں۔ حالانکہ اسلام جس جامعیت کا حامل ہے اور اس کے احکام و قوانین

فطرت سے موافقت کو جس اعتدال اور توازن کے ساتھ اپنے اندر لئے ہوئے ہیں وہ دوسرے مذاہب میں ناپید ہے۔ اسلام کے عقائد و احکام اگر عقل کی ترازو پر پورے نہ اترتے تو یہ کیونکر ممکن ہوا کہ ایک صدی سے کم عرصے میں یہ مذہب ساری دنیا میں پھیل گیا اور اس کے آگے تمام قدیم و جدید مذاہب و نظریات کی روشنی ماند پڑ گئی۔ دراصل اسلام کے خلاف اغیار کی نکتہ چینیوں کے ساتھ بعض نادان مسلمانوں کی اپنی کمئی فہم، کمزوریٔ ایمان اور ذاتی اغراض بھی کچھ کم موردِ الزام نہیں، جنہوں نے اسلام کے احکام میں تنگی اور سختی پیدا کر کے دینِ اسلام کی اصلی ہئیت کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ حالانکہ ارشادِ ربانی "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم ورضیت لکم الاسلام دینا" کہ آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تمہارے حق میں اسلام سے بحیثیت دین راضی ہوا، کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے مسلمان علماء اور مفکرین کو قرآن و حدیث کی روشنی میں احکام میں وسعت اور آسانی پیدا کرنی چاہیئے تھی تاکہ مسلمان دین اسلام سے تنگ دل اور اغیار معترض نہ ہوں۔

اسلام یقیناً ایک الہامی مذہب ہے۔ جس کی بنیاد قرآن و حدیث یعنی وحی جلی اور وحی خفی پر قائم ہے لیکن یہ وحی خواہ کتاب اللہ کی صورت میں ہو یا سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں، ہرگز عقل انسانی کی منکر یا اس کے خلاف نبرد آزما نہیں ہے۔ ہاں جن امور میں اللہ کی طرف سے وحی آچکی، خواہ وہ وحی مفصل ہو یا مجمل تو اس حد تک عقل کو وحی کے تابع رہنے کا حکم ہے۔

قرآنِ پاک میں "یا اولی الالباب" اے عقل والو! سے بار بار خطاب فرمایا گیا ہے۔ "افلا یتدبرون" "تم تدبر کیوں نہیں کرتے" کا شکوہ کیا گیا ہے۔ "لعلکم تتفکرون" اور "تعقلون" کے ذریعے غور و فکر سے کام لینے اور عقل کو استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اسی طرح "لا اکراہ فی الدین" کے ذریعے دینِ اسلام میں داخل ہونے اور

اس کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ کسی جبر و دباؤ پر نہیں بلکہ انسانی ضمیر اور اس کی عقلی قوت فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا اور فرمایا گیا۔

"ولو شاء ربک لجعل الناس امۃً واحدۃً ولا یزالون مختلفین الّا من رحم ربک ولذالک خلقھم"

اللہ کو منظور ہوتا تو سب آدمیوں کو ایک ہی طریقے کا بنا دیتا اور یہ لوگ آئندہ بھی اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اسی واسطے پیدا کیا ہے۔ لوگوں کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کے بارے میں انسان کی فطری آزادی کی بنیاد پر اختلاف کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا، اختلاف رائے کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہے۔ جس کے ذریعے انسانی عقل کو اپنا صحیح کردار ادا کرنے کے لئے اسلام کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا۔

"افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین"

جب یہ بات ہے تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان ہی لے آئیں۔ گویا ایمان لانے کا معاملہ جبر و اکراہ پر نہیں بلکہ انسان کی سلیم فطرت پر اعتبار کرتے ہوئے اس کی عقلِ سلیم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔ "سخرلکم ما فی السمٰوات والارض" یعنی یہ کہ مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تسخیر علم و تجربے اور عقل کی محتاج ہے۔ درحقیقت اسلام انسانی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں سے کام لینے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ اسلام عقل انسانی کی ہمت افزائی کرتا ہے اور عقل سے کام لینا سکھاتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" کہ ہم نے انسان کو بہترین نمونہ اور انداز میں پیدا کیا۔

یہ اسلام ہی ہے جو انسان کے سر پر "خلیفۃ اللہ فی الارض" کا تاج رکھتا ہے۔

انسان کی بلندی کا اس سے بڑا اور کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔

غرض قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں انسانی عقل کی فرمانروائی کو کھلے دل سے تسلیم کیا گیا ہے۔ البتہ جن احکام کے بارے میں وحی کے ذریعے نص قطعی موجود ہو، صراحت کے ساتھ وہ حکم قرآن و سنت میں موجود ہو تو پھر ایک مسلمان کے لئے ہرگز یہ امر روا نہیں رکھا گیا کہ جس چیز کے بارے میں اللہ اور اسکے رسول فیصلہ فرما دیں وہ اس کی تعمیل میں سرمو انحراف یا سرتابی کرے۔ بلکہ اس کے ذمہ یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے آئے ہوئے حکم کو بلا چون و چرا تسلیم کرے۔ درحقیقت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جو بھی احکام نازل ہوئے ہیں۔ وہ تمام احکام عقل و فطرت کے مطابق ہیں اور انسانی مصلحت اور انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کے تصور کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انسانوں کی مختلف طبائع ان کی اپنی ذاتی اغراض اور خواہشات نفس ان احکام کی حکمت کو سمجھنے سے عاجز ہوتی ہیں، نہ کہ خود حکم عقل سے عاری ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر مقرر فرمایا تو آپؐ نے معاذ بن جبلؓ سے پوچھا کہ تم لوگوں کے درمیان معاملات کا کیونکر تصفیہ کروگے؟ معاذ بن جبلؓ نے کہا کہ کتاب اللہ کے ذریعہ۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ پاؤ تو کیا کروگے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں سُنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا۔ اگر تم میری سنت میں بھی کوئی حکم نہ پاؤ تو پھر کیا کروگے؟ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ پھر میں اپنی رائے (اجتہاد) سے فیصلہ کروں گا۔ معاذ بن جبلؓ کی یہ بات سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے۔

آنحضرت کا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اجتہاد سے فیصلہ کرنے کی تعلیم دینا اسلام میں عقل کے دخل کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اور اسلام میں عقل کے کردار کی اس سے بڑی اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ خود اسلامی اصول فقہ میں قرآن و سنت اور اجماع

کے بعد قیاس کو ثانوی ماخذ قانون کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ قیاس قرآن و سنت کی روح کے منافی اور اجماع کے خلاف نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین کی تعلیم میں وحی پر عمل پیرا تھے لیکن اگر کوئی دنیاوی معاملہ ہوتا تو آپ ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کا گزر ایک باغ کی طرف ہوا جہاں ایک شخص کوئی پودا لگا رہا تھا۔ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ تم کام اپنی سمجھ کے مطابق کرو۔ یہ واقعہ صریح نص ہے اس امر پر کہ بعض دنیاوی معاملات جن میں عقل تجربے و مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے ان کے بارے میں اسلام نہ صرف عقل کے کردار کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کے استعمال کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

بلاشبہ، اسلام انصاف، صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔ وہ بے حیائی کی باتوں اور نامعقول کاموں سے روکتا ہے۔ صحیح عقائد اور اعلیٰ کردار اختیار کرنے پر زور دیتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے ایک خاکہ (فریم ورک) تجویز کرتا ہے۔ جس کی رنگ آمیزی اور حسن کاری میں انسانی عقل و دماغ کا پورا دخل ہے۔

اسلامی ثقافت

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی تادیب و تہذیب کے آتے ہیں۔ یہ اصطلاح انگریزی لفظ "کلچر" کے مترادف استعمال ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ثقافت کا لفظ استعمال نہیں ہوا البتہ "ثقف" مادہ سے "ثقفتموهم" اور "ثقفوا" پکڑنے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

لیکن یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ثقافت اور تہذیب میں ایک فرق ہے۔ تہذیب سے بالعموم سماجی اور معاشرتی ارتقاء مراد ہوتا ہے۔ جس کے اکثر مظاہر مادی ہوتے ہیں جبکہ ثقافت فکری نشوونما اور ارتقاء کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی ثقافت اس فکری تسلسل کا نام ہے جو اسلامی اقدار کی حامل ہو اور وہ اسلامی فکر زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کرے اس لحاظ سے ثقافت اپنے وسیع مفہوم میں بیک وقت ادب و شاعری، رقص و موسیقی، مصوری و نقاشی، طب و فن تعمیر، فلسفہ و سائنس اور طبیعیات و مابعد الطبیعیات حتیٰ کہ نظامِ قانون و حکومت سب کو شامل ہے یعنی ثقافت ایک مربوط فکری روح ہے جو ان سب میں جاری و ساری ہے۔ اسی روح و فکر کا نام ثقافت ہے۔

بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلامی ثقافت کے نام کی کسی چیز کا وجود نہیں جو کچھ ہے وہ ان ملکوں کی ثقافت ہے جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا اور انہوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں۔ بالفاظ دیگر ایران میں ایرانی ثقافت اور ترکی میں ترکی ثقافت تو ہے مگر اسے اسلامی ثقافت نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن میرے نزدیک ان حضرات

کی یہ رائے درست نہیں۔

اسلامی ثقافت اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے جس کی بنیادیں توحید، وحدت انسانی، عظمت انسانی، مساوات، امن عام اور قانون الٰہی کی بالاتری کے نظریات پر استوار ہیں۔ اسلامی ثقافت میں رنگ و نسل کا کوئی اعتبار نہیں کوئی ایک انسان بلحاظ حقیقت نفس الامری دوسرے انسان سے افضل نہیں مگر وہ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور متقی ہو۔ درحقیقت اسلامی ثقافت اپنی امیدوں اور آرزوؤں کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ اس کی وہ بنیادیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ ان تمام ثقافتوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں جو خواہ ترکی ثقافت کہلائے یا ایرانی۔ یہ ثقافتیں اپنے جوہر میں مسلم ثقافتیں کہلائیں گی جو اسلامی ثقافتی بنیادوں پر استوار ہونے کے سبب اسلامی ثقافتیں کہلانے کی مستحق ہونگی۔ مثلاً اسلامی ثقافت میں عقیدہ میں توحید ایک محکم ترین بنیاد ہے۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی جماعت خواہ وہ کسی خطہ یا ملک سے تعلق رکھتی ہو ایک ہی ثقافتی رشتہ کی کڑی ہو گی یعنی اس کا ثقافتی مظہر اپنے جوہر اور اصل میں توحید پر مبنی ہو گا۔ اگر اس مظہر سے شرک کی بو آتی ہو تو پھر وہ اسلامی ثقافت نہ کہلائے گی۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک عظیم الشان ہسپتال کسی قوم کی تہذیب کا مظہر ہے۔ لیکن اگر اس ہسپتال سے وابستہ ڈاکٹر اپنے نسخہ کی پیشانی پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" یا "ہوالشافی" لکھتے ہیں تو وہ ڈاکٹر یا حکیم اس قوم کے فکری اور ثقافتی رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس مثال میں ڈاکٹروں کی جماعت کا یہ طرز فکر اسلامی ثقافت کا ایک پہلو کہلائے گا۔ اسلام میں زندگی کا حقیقت پسندانہ نظریہ جو مادی و روحانی دونوں پہلوؤں کا نقطہ اتحاد ہے وہ اسلامی ثقافت کی جان ہے۔ جس میں زندگی کے بنیادی تصور اور رجحان کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے۔

اس حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ایک مثال کے ذریعہ اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ کسی مکان کے ایک کمرہ میں ایک بے نظیر یونانی مجسمہ رکھا ہوا ہے اور ساتھ والے

کمرہ میں ایک شیر خوار بچہ بستر پر لیٹا ہوا ہے مکان کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور صورت کچھ ایسی ہے کہ دونوں میں صرف ایک چیز بچ سکتی ہے یعنی مجسمہ یا بچہ ــــ ایسی صورت میں یونانی ثقافت کا نمائندہ اس مجسمہ کے بچانے پر زور دے گا اور کہے گا ایسا مجسمہ پھر نہیں مل سکتا جب کہ بچے ہر روز ہزاروں اور لاکھوں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن اسلامی ثقافت کا داعی بچہ کے بچائے جانے پر زور دے گا۔ اس کے نزدیک ایک انسانی جان بہر طور قیمتی ہے۔ یہی وہ فکری پہلو ہے جس نے اسلامی ثقافت کو ایک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر عطا کیا ہے۔

جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا تحصیل علم بھی اسلامی ثقافت کا ایک بنیادی عنصر ہے چنانچہ احادیث نبوی میں اس طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ حضور کا ارشاد ہے "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" "تم علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی درسگاہ کی مسافت اور دوری کے سبب تحصیل علم سے باز نہ رہو۔ ایک اور حدیث ہے "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" یعنی علم حاصل کرنا ایک فریضہ ہے ہر مسلمان پر۔ لیکن تعین مقصد کے بغیر محض حصول علم اسلامی ثقافت کا کوئی منفرد پہلو نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن پاک کہتا ہے "اقراء باسم ربك الذی خلق" یعنی تو پڑھ اپنے اس رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا یعنی علم کا حصول معرفت خداوندی کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے فرض کیا گیا ہے اور یہی اسلامی ثقافت کا ایک بنیادی پہلو ہے کہ تحصیل علم کا مقصود اللہ کی ذات کی معرفت اور اس کی خوشنودی ہو۔ ورنہ یوں تو تحصیل علم کا نظریہ دیگر مذاہب اور اقوام کی ثقافتوں میں بھی موجود ہے۔

ثقافت کے موضوع پر اس بنیادی گفتگو کے بعد میں ثقافت کے اس مخصوص مفہوم کی طرف آتا ہوں جس کو فنونِ لطیفہ سے تعبیر کیا جاتا ہے آجکل ثقافتی عمل یا کلچرل سرگرمی کو عام طور پر رقص و موسیقی مصوری و پینٹنگ اور فنونِ لطیفہ کی دوسری شاخوں کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ اسلام اس سلسلہ میں اپنے ثقافتی دائرہ میں ایک مخصوص طرزِ فکر

رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام مرد و عورت کو ستر ڈھانکنے پر انتہائی زور دیتا ہے۔
یعنی مرد کیلئے ناف سے گھٹنوں تک ڈھانکنا چاہیئے اور اس کا ستر یہی ہے جبکہ عورت
کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیر کے انگوٹھے سے لیکر سر کے بال تک ڈھانکے رکھے۔
صرف پہنچے تک ہاتھ اور چہرہ کھلا رہ سکتا ہے۔ قرآن پاک سورۃ احزاب کی
۳۳ ویں آیت میں فرماتا ہے۔ "وقرن فی بیوتکن و لا تبرجن تبرج الجاهلية
الاولی"

اس آیت میں عورتوں کو ہدایت کی جارہی ہے وہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں
یعنی بے ضرورت گھر سے باہر سڑکوں اور بازاروں میں ماری ماری نہ پھریں اور یوں
پھر پھر کر عہد جاہلیت کی طرح اپنی زیبائش و آرائش کا مظاہرہ نہ کریں۔
ایک اور جگہ سورۃ نور کی ۳۱ ویں آیت میں ارشاد ہو رہا ہے "لا یضربن بار
جلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن" یعنی عورتوں کو چاہیے کہ زمین پر اپنے
پیر زور زور سے نہ مار کر چلیں کہ انکا سنگھار جو انہوں نے چھپا رکھا ہے۔ لوگ اس سے
واقف ہو جائیں ان صاف و صریح ہدایات کے پیش نظر آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ
رقص و سرود کی یہ محفلیں، مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط، عریانی، مردوں کی
محفلوں میں زنانہ رقص جس کو جوش ملیح آبادی کی زبان میں اعضاء کی شاعری ہے
کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اسکا اسلامی ثقافت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔
اسلام ایک ایسے پاکیزہ معاشرے اور مذہبی اور اخلاقی اقدار پر مبنی ثقافت کا
قائل ہے۔ جس کا منظر نامہ بنیادی اور اساسی طور پر اسلامی ہو۔ اسکا یہ مطلب نہیں
ہے کہ اسلام زندگی کے جمالیاتی تصور سے عاری ہے لیکن اسلام میں اس کی عکاسی
ان اخلاقی حدود کے اندر ہونی چاہیے جو کتاب اللہ اور سنت نبوی (صلی اللہ علیہ
و آلہ وسلم) کے ذریعہ ثابت اور طے شدہ ہیں۔

اسلامی مساوات

جب ہم "اسلامی مساوات" کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری مراد اسلام کے اس نقطۂ نظر سے ہوتی ہے جو وہ انسان اور انسان کے درمیان زندگی کے مختلف دائروں میں ان کے باہمی ربط و تعلق کے سلسلے میں رکھتا ہے۔ زندگی کے یہ دائرے مختلف بھی ہیں اور متنوع بھی، لیکن ایک دائرہ سب میں مشترک ہے اور وہ ہے باہم دو انسانوں کے درمیان صرف بحیثیت انسان کے مساوات۔ یعنی انسانی مساوات، اسلام کے نزدیک یہ ایک بنیادی حقیقت ہے۔ اس کے بعد مساوات کے تعلق سے دوسرے دائرے آتے ہیں جن میں سب سے زیادہ وسیع اور طاقتور دائرہ اسلام کے نزدیک مذہب کا ہے۔ اس کے بعد انسانوں کے درمیان۔ قانونی مساوات ہے، اس کے ساتھ ہی معاشی اور معاشرتی مساوات کے بارے میں اسلام کا خاص نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔

جہاں تک بحیثیت انسان کے اسلامی مساوات کا تعلق ہے۔ اسلام واشگاف، قطعاً غیر مبہم اور نہایت واضح الفاظ میں دنیا کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ تمام انسان انسانیت کے ناطے سے آپس میں برابر ہیں ان میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں۔ ۹ ذالحجہ ۱۰ھ کو جبل رحمت سے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ اعلان کیا کہ "گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں۔ تم سب انسان اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے اور تم بھی مٹی سے پیدا کئے گئے ہو، تم سب برابر ہو، جو کچھ انسانی فضیلت ہے وہ تقوٰے کے سبب ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پوری

تاریخ انسانی میں سب سے نمایاں اور سب سے اہم اعلان ہے، جس کی شہادت نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی دیتی رہیں گی۔ اگر آج اس فرمان نبوی پر عمل ہو تو ساری دنیا امن و سکون کا سانس لے سکتی ہے۔ رنگ و نسل کی بنیاد پر تفریق، مختلف علاقوں اور خطوں میں بسنے والوں کے درمیان مقامی، قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر امتیاز (Discrimination) اور اس سے پیدا ہونے والے تمام تر فتنے یکسر ختم ہو سکتے ہیں۔ میں یہ بات پورے شرح صدر اور یقین و اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر دنیا کو امن چاہیئے تو اسے صحرا نشین رسولِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس اعلان عام کو انسانی بنیاد پر عملاً نافذ کرنا ہو گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام عالمگیر انسانی برادری کے اس عظیم الشان نظریئے اور اعلان کے بعد مذہب کی بنیاد پر اسلامی اخوت کے نظریئے کے تحت وحدت ایمانی کی بنیاد پر اسلامی مساوات کا دوسرا بڑا اور اہم اعلان کرتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خواہ وہ کسی قبیلے، خاندان، علاقے یا ملک کے رہنے والے ہوں۔ ان کے درمیان بحیثیت مسلمان مکمل مساوات اور برابری ہے۔ یہ اللہ کا ایک بہت بڑا انعام ہے جو مسلمانوں کو دیا گیا۔ یہ تعلق تمام جھگڑوں کو نمٹانے کی بنیاد ہے خواہ وہ جھگڑے انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرو۔" آپؐ کا یہ فرمان جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے مسلمانوں کیلئے مشعلِ راہ ہے۔

انسانی اور مذہبی مساوات کے ساتھ ہی اسلام قانونی مساوات کا مخصوص نظریہ بھی رکھتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ قانونی حق کے حصول اور نفاذ کے لئے سب کو یکساں طور پر عدالت انصاف سے رجوع کرنے کا حق ہے۔ قانون کے تحت سب کو مساوی طور پر یکساں تحفظ حاصل ہے۔ وہ سب کے ساتھ چھوٹا ہو یا بڑا، غریب ہو یا مالدار، عام شہری ہو یا افسر یکساں قانونی سلوک کا قائل ہے۔

قانونی مساوات کا یہ اسلامی نظریہ اقتصادی مساوات کے حصول کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ کوئی نظریہ یا اصول خواہ کتنا ہی اچھا ہو اس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے نفاذ اور تعمیل کا مناسب نظام نہ ہو۔ اس لئے اسلام نے قانونی مساوات پر پورا زور دیا ہے تاکہ معاشرہ سے سماجی، معاشرتی، اقتصادی و معاشی خرابیاں اور ناہمواریاں جلد سے جلد دور ہوں اور نیکیاں پروان چڑھیں۔

جہاں تک معاشی میدان میں اسلامی مساوات کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام میں اقتصادی مساوات کا اصول کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک جامع، مربوط اور مستحکم نظریہ کے تابع ہے۔ اسلام پوری کائنات کو خدا کی پیدا کردہ اور اس کی اصل ملکیت قرار دیتا ہے "ما خلقت ھذا باطلا" کے الفاظ میں اس عقیدے کا مبلغ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو، اس کی چیزوں کو بے کار و لاحاصل پیدا نہیں کیا بلکہ عام انسانی بہبود اور استفادے کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے تحت اپنی تمام تر صلاحیتوں کو روبہ کار لاتے ہوئے زمین کے پوشیدہ خزانوں کو باہر نکالے اور اپنی عقل، تجربے، کوشش اور تحقیق و جستجو سے کام لیکر ان کو بنی نوع انسان کے مفاد میں استعمال کرے۔ ساتھ ہی اپنی کوششوں کے ثمر و نتیجے میں یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے کہ "اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر" اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق عطا فرماتا ہے۔

حیاتِ انسانی کے بارے میں اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ یہ زندگی گو عارضی اور ختم ہو جانے والی ہے لیکن اس زندگی کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق جدوجہد اور سعی و عمل سے بہرہ ور ہونا چاہیئے۔ انسان اس زمین پر احکامِ الٰہی کی تنفیذ کے لئے خلیفۃ اللہ ہے۔ اس کا ذمہ ہے کہ وہ کائنات اور حیات انسانی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کے بموجب اپنی تمام تر صلاحیتیں اس زندگی کو بہتر بنانے میں صرف کرے لیکن اس طرح کہ مرنے کے بعد اللہ کے سامنے

اپنے تمام اعمال و افعال کی جوابدہی کا تصور ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے۔ یہ عقیدہ اس کے افعال میں توافق اور توازن پیدا کرتا ہے اور عدل و مساوات کے لئے ایک سازگار فضا، اور ماحول پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اسلام اقتصادی مساوات کے سلسلے میں فرد اور معاشرے کے درمیان ظلم و ناانصافی کو ختم کرنے کیلئے باہمی تعاون کی اسپرٹ پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔ اگر دنیا کے سارے خزانے بھی اس کے قبضۂ قدرت میں آجائیں تب بھی وہ انہیں خرچ ہوجانے اور ہاتھ سے چلے جانے کے خوف سے اپنے پاس ضرور روکے رکھے گا۔

اشتراکیت کے نزدیک اقتصادی مساوات کا محدود مفہوم معاوضوں میں مساوات ہے کہ معاشی فرق کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اس کے برخلاف اسلام ایک زیادہ بڑے دائرے میں انسانی مساوات کا داعی ہے۔ جس میں معاشی مساوات بھی شامل ہے۔ لیکن وہ "لیس للانسان الا ما سعی" کا قائل ہے کہ انسان اس قدر معاوضہ پانے کا مستحق ہے جس قدر اس نے محنت کی، کوشش کی۔ اسلام کے نزدیک اقتصادی مساوات کا یہ مفہوم ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت کار اور کارکردگی کی بنا پر معاشی فوائد حاصل ہوں۔ ہر ایک کے لئے یکساں اقتصادی مواقع ہوں۔ ملک کے اقتصادی وسائل اور ذرائع پیداوار کسی خاص گروہ یا طبقے کی ملک نہ ہوں۔ اجارہ داریاں نہ ہوں۔ معاشی انصاف کے نام پر ظلم و استحصال نہ ہو۔ اسلام سعی و عمل کے ذریعے ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے آزاد موقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن بے جا اور ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے کو اسلام ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ وہ جوئے، سٹے اور سود کے ذریعہ دولت کی افزائش کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ وہ دولت کے ارتکاز یعنی چند ہاتھوں میں اکٹھا ہونے کے خلاف دولت کی گردش اور تقسیم پر زور دیتا ہے تاکہ اقتصادی عدم مساوات دور ہونے میں مدد ملے۔ اگر آج معاشرے میں اقتصادی تفاوت بہت زیادہ ہے تو یہ سرمایہ دارانہ نظام کے اختیار کئے رہنے اور اسلامی نظام سے مسلسل غفلت،

بلکہ انحراف کا نتیجہ ہے۔

البتہ اسلام کے معاشرتی دائرے میں مرد اور عورت کے درمیان اس لحاظ سے عدم مساوات ضرور موجود ہے کہ مرد کو اپنا مال اپنی بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے سبب فضیلت دی گئی ہے اور یہ بات فطرت کے عین مطابق ہے۔ لیکن عورت اور مرد کے درمیان اس لحاظ سے کوئی تفریق و امتیاز نہیں کہ اسلام نے عورت کو چودہ سو سال پہلے کسب مال، حصول ملکیت اور اختیار صرف میں مرد کے برابر درجہ دیا ہے۔ جب کہ یورپ کے ترقی یافتہ دور میں ۱۸۸۳ء تک قانون انگلستان کے تحت ایک شادی شدہ عورت کو اپنے ذاتی نام میں جائیداد خریدنے یا رکھنے کا سرے سے حق ہی نہ تھا۔ اسلام میں عورت کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے زندگی کے اقتصادی عمل (Economic activity) میں حصہ لینے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ اقتصادی عمل اس کی ازدواجی ذمہ داریوں سے متصادم اور ان کی بجاآوری میں حارج نہ ہو۔

یہ بات ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ افراد کی صلاحیتوں میں فطری طور پر پایا جانے والا تفاوت موجود ہے۔ ایک شخص ذہین ہے، دوسرا غبی، تیسرا شخص غیر معمولی ذہنی صلاحیت کا مالک ہے۔ اسی طرح صحت، مضبوط جسم اور قوت برداشت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ دماغی اور جسمانی کام ان کی کارکردگی اور صلاحیت کے اعتبار سے اقتصادی نتائج بھی مختلف ہو سکتے ہیں، بلکہ ہوتے ہیں۔ ہاں انسان کی بنیادی اقتصادی ضروریات اور ان کی فراہمی ایک اسلامی مملکت کا اولین فریضہ ہے، جو اسے مساویانہ طور پر بلا امتیاز پورا کرنا چاہیے۔

اسلامی قانون کی ہمہ گیری

مغربی فلاسفہ اور ماہرین قانون اس نظریہ کے حامل نظر آتے ہیں کہ انسانی معاشرے میں بیک وقت قانون اور اخلاق کے دو معیاری نظام (NORMATIVE SYSTEM) پائے جاتے ہیں، اور یہ دونوں نظام بعض مقامات پر ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ کانٹ (KANT) نے قانون اور اخلاقیات کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قانون ہمارے خارجی طرز عمل (EXTERNAL CONDUC) کو تجویز (PRESCRIBE) کرتا ہے اور اخلاق (MORALITY) ہمارے خاص داخلی طرز عمل کو متعین کرتا ہے۔ اسی طرح انقلابی مفکر کیلسن (KELSEN) اخلاقی تصورات کو قانون میں سمو دینے کا سخت مخالف ہے، اس کے خیال میں اخلاقیات کو محض ایک معروضی (OBJECTIVE) حقیقت (PHENOMENON) کے طور پر شامل نہیں کیا جا سکتا، کیلسن کی رائے دراصل مجرد قانون (PURE LAW) کے نظریے پر مبنی ہے۔

اسلامی قانون کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی قانون اپنے اندر مذہبی ور اخلاقی نظام سموئے ہوئے ہے، اور چونکہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے انون کے دائرۂ کار کو بھی منضبط کرتا ہے۔ اس لئے اسلامی قانون ایک ایسے ایتی عنصر کا مالک ہے، جو اپنے مزاج کے اعتبار سے دوسرے قوانین سے مختلف ہے اور اس خصوصیت میں دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اس کا ثانی نہیں۔ اسلامی قانون

کا اصل مبدا اور سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور خلفاء راشدین (۱۱ تا ۴۰ ہجری) کے دور خلافت میں اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور بنو امیہ (۴۱ تا ۱۳۲ ہجری) اور بنو عباس (۱۳۲ تا ۶۵۶ ہجری) کے عہد میں قانون دانوں کی انفرادی کوششوں کے سبب اس کا ارتقاء عمل میں آیا۔

اسلامی قانون اللہ اور اسکے رسول کی مرضی کا نام ہے، جس کا مبدا، اور مخرج قرآن و سنت ہے۔ اسی لئے اسلامی قانون ہمارے داخلی اور خارجی دونوں طرز عمل کو متعین کرتا ہے، یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلامی قانون کو دوسرے قوانین سے ممتاز کرتا ہے۔ دنیا کے دیگر قوانین انسان کی داخلیت سے لاتعلق رہتے ہوئے اس کے خارجی طرز عمل سے بحث کرتے ہیں اور اس کے افعال کے اصل محرکات کو چنداں درخور اعتنا نہیں سمجھتے، جبکہ اسلامی قانون انسان کے ضمیر، اخلاق اور اس کے مقتضیات اور اس کے فطری تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور انسان کی اخلاقی اصلاح کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے اپنا دائرۂ کار منضبط کرتا ہے۔ اسلامی قانون کی ہمہ گیریت اس کا دائرۂ عمل انفرادی نہیں ہے۔ اصل دائرۂ کار زندگی ہی ہے، اس سے معاشرے کی زندگی سنورتی ہے اور نیکی رواج پاتی ہے۔

مسلمان معاشرہ جس اساس پر قائم ہے۔ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے مختلف بیرونی اثرات اور خارجی عوامل کے باوجود یہی اطاعت اللہ اور اطاعت الرسول ہمارے معاشرے کی شیرازہ بندی کا سب سے بڑا سبب ہے اور اس معاشرے کو متحد رکھنے والا اسلامی قانون اور اسلامی ضابطہ حیات ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اللہ کا قانون حرف آخر ہو، غیر اسلامی قوانین کا نفاذ تقدیس اور احترام کے اس تصور سے عاری ہوگا جو اسلامی قانون کا جزو لاینفک ہے۔ اسلامی قانون عدل و انصاف پر مبنی ہے، جس سے معاشرے میں باہمی تعاون کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف غیر اسلامی قوانین سے تعاون کے بجائے کشمکش اور اختلاف کی راہیں نکلتی ہیں۔ یکرنگی اور یکجہتی کے بجائے انتشار اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے اور افراد کی

توانیں تعمیر ملت کے اجتماعی کام پر صرف ہونیکے بجائے باہم زور آزمائی پر صرف ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں آگے قدم بڑھنے کے بجائے رک جاتے ہیں، اور دامن کانٹوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارے فقہاء کرام نے اسلامی قانون کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) مناکحات (۲) معاملات اور (۳) عقوبات۔ مناکحات میں انسان کی عائلی زندگی کے جملہ قوانین داخل ہیں، مثلاً نکاح، طلاق، خلع، مبارات، تنسیخ نکاح کی مختلف صورتیں، نسب اولاد، حضانت، نفقہ، وقف، ہبہ، وصیت اور وراثت وغیرہ۔

معاملات میں وہ تمام مدنی (CIVIL) قوانین داخل ہیں جن سے انسان کو اجتماعی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ جیسے بیع وشریٰ (خرید و فروخت) اور معاہدہ وغیرہ، اور عقوبات میں وہ قوانین شامل ہیں جو انسان سے سرزد شدہ جرائم اور ان کی سزاؤں سے بحث کرتے ہیں۔

مغربی تعلیم اور تہذیب کے مرعوب کن اثرات کے تحت اب یہ بات عام طور پر سننے میں آتی ہے کہ اسلامی قوانین میں مقرر کردہ سزائیں سخت اور بے رحمانہ ہیں۔ دراصل یہ بدگمانی اسلام کے فلسفۂ قانون سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام میں جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ ان کا مقصد معاشرے میں عدل کا قیام اور اخلاق کی حفاظت کرنا ہے۔ اس لیے جرم کے وہ اثرات جو معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے اور اسلام کے قانون کی توجہ معاشرے کی حقیقی اصلاح کی جانب ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر شریعت اسلامی کے احکام کا تعلق انسان کے ضمیر سے ہے۔ اور اس کے احکام کی جوابدہی پر انسان کا اپنا وجدان شہادت دیتا ہے اور دنیاوی حکم یا سزا کے ساتھ ساتھ انسان کا دینی ضمیر یہ محسوس کر لیتا ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں بھی اللہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور اللہ سے اس کی کوئی حرکت پوشیدہ نہیں رہ سکتی، وہ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور جو

کچھ سینوں میں پوشیدہ ہے اس کو بھی۔

ضمیر انسانی سے اسلامی قانون کو بڑا تعلق ہے اور وہ افراد انسانی کو جرائم کے ارتکاب سے محفوظ رکھتا ہے، کیونکہ اس کو یہ خوف ہوتا ہے کہ اللہ اس کے ہر فعل سے واقف ہے اور اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے گا۔ اس کی اطلاع اللہ تعالیٰ کو ہوگی۔ چنانچہ وہ ایسے امور کی جانب متوجہ ہوتا ہے جو اللہ کی رضا کا موجب ہوں اور اس سے اس کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ اس عمل کے کرنے سے اس کی خواہش نفس اکثر مانع آتی ہے اور جب انسانی ضمیر کی تربیت دینی طور پر ہوتی ہے تو اس کے دل میں دوسرے انسانوں سے الفت و محبت پیدا ہوتی ہے، اور بغض و حسد اور لالچ جو انسان کو جرائم پر آمادہ کرتے ہیں معدوم ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں انسان میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں سے کمتر کیوں ہے اور دوسرے اس سے مال و ثروت میں زائد کیوں ہیں؟ اس لئے کہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ ہی سب کا رزاق اور بڑی قدرت والا ہے۔ چنانچہ جب روح انسانی میں یہ عقیدہ جڑ پکڑ لیتا ہے تو نفس انسانی میں جرائم کے جراثیم فنا ہو جاتے ہیں اور اگر کبھی جرم کا وقوع ہوتا بھی ہے تو وہ ایک ایسی ظلمت کی بنا پر جو انسانی ضمیر پر محیط ہو جاتی ہے اور بالآخر اس کا دینی ضمیر خود اس کے اعتراف پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اس کے برخلاف غیر اسلامی قوانین کے نفاذ سے جو امر روزمرہ مشاہدے میں آتا ہے وہ یہ کہ مجرم جب سزا کاٹ کر ——— جیل سے باہر آتا ہے تو معاشرے کے لئے مزید نقصان اور ضرر کا باعث ہوتا ہے، کیونکہ قید خانہ نے اس کی انسانیت اور انسانی ضمیر ہی کو تباہ کر دیا۔ نہ اس کی نگاہ میں دین ہی کی کوئی وقعت رہی اور نہ وہ اخلاق جو لوگوں سے اس کے دل میں الفت پیدا کرنے کا موجب ہو، اور نہ وہ ضمیر جو اس کو مہذب بنا سکے۔

اسلامی قانون کا نفاذ ملت اسلامی کا فریضہ ہے، اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ اللہ کے آخری رسول ہیں اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو پھر

اس کا تفصیلی مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو شریعت مسلمانوں کو دی گئی۔ وہ آخری ہدایت ہے۔ کوئی اور ہدایت نہ آنے والی ہے اور نہ اس سے بہتر ہے اور نہ ہوسکتی ہے، اسلامی شریعت ہمہ گیر ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں اللہ کے رسول نے ہمیں ہدایات نہ دی ہوں اب یہ امت کا فرض ہے کہ وہ ان ہدایات کا علم حاصل کرے اور راہِ عمل میں ان سے رہنمائی حاصل کرے کیونکہ اسی میں ہماری دین و دنیا کی فلاح ممکن ہے۔

اسلامی اقدار[1] کی ترویج و اشاعت[2]

اسلامی اقدار جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مذہب اسلام کے تابع ہیں۔ ان کو ہم values کہہ سکتے ہیں۔ بعض اقدار تو بنیادی ہیں اور بعض اضافی ہیں جن کو ہم absolute اور Relative کہتے ہیں۔ چنانچہ ایسی اقدار جو بنیادی ہیں وہ ناقابل تبدیلی ہیں اور جو اضافی ہیں وہ حالات و زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اب مشکل کام یہ ہے کہ کونسی اقدار اضافی ہیں اور کونسی مطلق اور یہ کہ انکے درمیان توازن کو کیسے قائم رکھا جائے؟ مثال کے طور پر عصمت و عفت بنیادی قدریں ہیں اور پردہ ایک اضافی چیز ہے لیکن اگر وہ اضافی چیز بنیادی قدر میں مداخلت کرنے لگے اور اس مقصد کو تہہ و بالا کرنے لگے تو پھر اس اضافی قدر میں بھی سختی برتی جائے گی تاکہ بنیادی قدر یعنی عصمت و عفت پامال نہ ہو۔

آج جو ہماری بنیادی اقدار کی پامالی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ساری قوم زر پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ مثلاً دیانت داری نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے ہر مذہب اور متمدن مملکت کی بنیادی قدر ہے بلکہ دوسرے مذاہب میں یہ قدر بالعموم اپنے مذہب اور ملک تک محدود ہے۔ اسلام میں مذہب و ملت کی قید سے بالاتر عام انسانی سطح پر بین الاقوامی پیمانے پر اس کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن آج ہمارے یہاں صورت حال دوسرے مذاہب اور ممالک سے بھی شاید بدتر ہو۔ مثلاً ہمارے برآمدی تاجر حضرات کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ وہ نمونہ کچھ دکھاتے ہیں اور مال کچھ بھیجتے ہیں ——— ہماری درسگاہوں میں عام

صورت یہ ہے کہ استاد خود بنیادی اقدار سے عاری یا پوری طرح مزین نہیں ہیں جس کی بالخصوص ایک استاد کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ جب طالب علم اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر زندگی کے میدان کارزار میں قدم رکھے گا تو وہاں اس کو ان اقدار کے برتنے کا موقع ملے گا۔ اس کی جیسی تربیت اسکول اور کالج میں ہوگی، اسی طرح وہ اقدار کو برتے گا۔

اسی طرح ہمارے گھر، جن کی حیثیت معاشرے کی تشکیل میں بنیادی ہے، وہ بھی اس سلسلے میں ہماری نوجوان نسل کی حسب ضرورت مدد نہیں کر رہے اور اس کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین زندگی کے پھیلے ہوئے مشاغل میں کچھ اس طرح مشغول ہیں کہ انہیں اپنے بچوں کی اعلیٰ اقدار کے ساتھ تربیت کرنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آپ ہماری درسگاہوں میں چلے جائیں، یا بازاروں میں، کردار کی بلندی اور اسلامی اقدار کے مظاہر آپ کو کہیں مشکل سے دیکھنے میں آئیں گے۔

اور اس کا سبب ہمارا وہ فرسودہ مغرب سے متاثر بلکہ مرعوب نظام تعلیم ہے۔ جس نے ہماری اسلامی اقدار کی بنیادوں کو کبھی جڑ پکڑنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

جو بھی حکومت کرسی اقتدار پر قبضہ جماتی ہے وہ تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتی اور کرتی ضرور ہے، لیکن کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بنیادی غلطی یا خرابی رہ جاتی ہے کہ مزید بگاڑ ہی پیدا ہونے لگتا ہے۔

وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں فکری سطح پر مادی فلسفہ، الحاد کے نظریے کو تقویت پہنچ رہا ہے۔ اس کو کمزور کرنے کے لئے روحانی اقدار کی سربلندی کے لئے سر توڑ کوششیں نہیں کی جاتیں۔ مذہب کو ایک گئی گزری سی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ صحیح مذہب کی ضرورت انسان کو ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ورنہ وہ اوہام کا شکار بنا رہے گا، اور چھوٹے چھوٹے بت تراش کر ان کی پرستش کرتا رہے گا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ سیاست، معیشت، فلسفۂ اخلاق، غرض ہر جگہ سے مذہب کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور یہ مغرب کی اس فسون کاری کے سبب ہوا جو نام نہاد ترقی کے نام پر ہمیں بہت عزیز ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے تک قانون سازی کی راہ میں الہامی اصولوں اور ہدایات کی پیروی کو قطعاً غیر ضروری بلکہ ازمنۂ قدیم کی یادگار کہہ کر زندگی سے باہر کی چیز سمجھ لیا گیا۔ زندگی کے جدید میکانکی تصور نے مادی نظریات کو وجود بخشا اور الہامی یا دوسرے لفظوں میں روحانی اقدار پر فتح حاصل کر لی۔ زندگی کے اس میکانکی تصور نے انسان کو صرف اس کے اپنے جسم کی ضرورتوں کی تکمیل تک محدود کر کے رکھ دیا، چنانچہ تمام انسانی کوششوں کا محور بھی پھر جسم بن کر رہ گیا اور روح اور اس کے تقاضے نظر سے پوشیدہ ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے اس میکانکی تصور نے لادینیت کے نظریئے کو قوت بخشی۔ چنانچہ کمیونزم یا سوشلزم زندگی کے اس مادی تصور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو کائنات کے نظم و نسق میں خدا کے وجود کے نہ صرف یہ کہ قائل نہیں بلکہ اس کی ضرورت کے احساس و ادراک سے بھی یکسر خالی ہیں۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی حاکمیت کا تصور پیدا ہوا جس نے حاکمیت جمہور کے نظریئے کو جنم دیا کہ جمہور خود مل جل کر اکثریت کی بنیاد پر اس دنیا کا (یا اپنے اپنے ملک کا) نظم و نسق چلائیں۔ انہیں کسی الہامی ہدایت یا خدائی قانون کی ضرورت نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔

زندگی کے اس مادی اور میکانکی نقطۂ نظر نے ایک اور ظلم یہ کیا کہ صنعتی انار کی کو رواج دیا۔ چنانچہ آج یورپ و امریکہ کے عام بازاروں، بسوں اور ٹرینوں میں جس بے اخلاقی اور بے حیائی کے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں اس کا نظر بھر کر دیکھنا تو کجا ذکر کرنا بھی محال ہے۔ پس مختصر ترین لفظوں میں یہ کہا جا

سکتا ہے کہ "حیوانیت اپنے پورے زور پر ہے"

اس تمام تر تصور کے جو عملی مظاہر آنکھوں کے سامنے آئے ان سے ثابت ہوا کہ جدید انسان کے سامنے مادی ضرورتوں اور راحتوں کی تکمیل یا دوسرے لفظوں میں بہ ہر قیمت اصل چیز دنیا کی کامیابی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر اسلام کے بالکل خلاف اور الٹ ہے۔ اسلامی نظریہ خدا پرستی اور خدا خوفی کی بنیاد پر زندگی کی تشکیل اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ جو اس دنیا کی زندگی کے اختتام پر آخرت کی زندگی کے عقیدہ کے ساتھ جزا و سزا پر قائم ہے۔

اسلامی نظام اور اس کے تقاضے

جب ہم "اسلام" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد چند رسوم اور عبادات کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ہم "اسلام" سے ایک مکمل ضابطہ حیات مراد لیتے ہیں جو ایک مسلمان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے تمام دائروں اور گوشوں پر حاوی ہے، جس میں بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کی نشاندہی اور خود اللہ کے بندوں کے درمیان باہمی اشتراک و تعلق کی حد بندی ہوتی ہے۔ اور جب ہم اس ضمن میں اسلام کے تعلق سے "نظام" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد اس نظام کی مکمل عملی شکلیں ہوتی ہیں جو زندگی کے مختلف دائروں میں متشکل ہو کر ہمارے سامنے آتی ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہوتی ہیں جس کا لفظ "نظام" خود تقاضہ کرتا ہے۔

نظام "نظم" سے بنا ہے: "نظام" کا لفظ "نظم" سے بنا ہے اور نظم کے معنی ایک سلسلے اور لڑی کے ہیں جیسے موتیوں کی لڑی۔ اصناف شعر میں "نظم" کو اسی لئے نظم کہتے ہیں کہ وہ ایک خیال کو باہمی ربط و تسلسل کے ساتھ مختلف اشعار کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ چنانچہ اسلام کا نظام مختلف دائروں میں اپنے متعدد مظاہر رکھنے کے باوجود اسلام کے اس اساسی تصور زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس کا اسلام داعی ہے۔ کیونکہ ایک مسلم معاشرے کی معیشت و معاشرت، آئین و سیاست، علم و اخلاق، تہذیب و تمدن، غرض زندگی کے تمام تر مناظر اور مظاہر خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی انسان کے تصور زندگی کے رہین منت اور تابع بلکہ اس کا عکس ہوتے ہیں۔

حسّی تمدّن: اسلام اپنے تصور نظام زندگی میں حسّی تمدن کا مخالف ہے۔ حسّی تمدن میں غیر مادی شے کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس تمدن میں حیات بعد الممات کی حقیقت کا انکار اور انسان کو کلی طور پہ آزاد و خود مختار قرار دے کر اس کی دنیوی زندگی کا واحد مطمح نظر مادی فائدہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ روح، اس کے تقاضوں اور متعلقات کے انکار کے سبب جسم انسانی اور اس کی ضرورتیں انسانی توجہ کا اصل مرکز اور محور قرار پاتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار جو حسّی تمدن کے اس تصور کی تکمیل میں مانع یا مزاحم ہوں یا تو ان کا سرے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور یا ان کو اضافی حیثیت دے کر ان کی من مانی تاویلیں اور تعبیریں گھڑلی جاتی ہیں۔ اس حسّی تمدن کی آج کے اشتراکی معاشروں میں کلیتاً اور مغربی سرمایہ دارانہ معاشروں میں خاصی پذیرائی ہو رہی ہے۔

الہامی تمدن: اس کے برخلاف اسلام الہامی تمدن کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ جس کی بنیاد وحی الٰہی پر قائم ہے اور جس کے ماننے والے جسم و روح دونوں کے تقاضوں اور متعلقات میں باہمی عدل و توازن پیدا کرتے ہیں اور ان کی تمام تر سرگرمیاں انسانیت کے وسیع تر مفاد میں ہوتی ہیں۔

عقیدۂ توحید و رسالت: اسلام اپنے اس معاشرے یا تمدن کی تشکیل میں جس چیز کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

وہ توحید باری تعالیٰ ہے کہ اس کائنات کی حاکمیت اعلیٰ اللہ اور صرف اللہ کو حاصل ہے اور انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس حاکم اعلیٰ کے ہر حکم کے آگے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر دے۔ اور یہ حکم یا احکام خدا کی طرف سے اس انسان کو انبیاء کرام کے ذریعے پہنچتے رہے ہیں اور اس سلسلے کی آخری کڑی سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید و فرقان حمید میں ارشاد فرماتا ہے:-

"فلا وربك لا يؤمنون حتىٰ يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليما"

اس آیت کریمہ کے ذریعے اس امر کی تلقین کی جارہی ہے کہ مسلمان معاشرہ اسوقت تک صاحب ایمان قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ وہ ان امور میں جن کے بارے میں باہم مسلمانوں میں اختلاف ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم نہ بنالیں اور جو کچھ آپؐ فیصلہ فرمادیں وہ اس فیصلے سے اپنے قلبوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ مکمل انقیاد و اطاعت میں اپنا سر تسلیم آنحضرتؐ کے فیصلے کے آگے خم کردیں۔

اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا یہ تصور عالمی انسانی برادری اور عالمی انسانی مساوات کے نظریئے کو پیدا کرتا ہے اور اس سے انسان پر انسان کی حاکمیت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ بادشاہی، جاگیرداری، اشراقیت، برہمنیت، پاپائیت اور آمریت سب کی نفی ہو جاتی ہے۔

عقیدۂ آخرت: ایک مسلمان کے لئے اس کائنات پر اللہ کی حاکمیت اور اس کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی مکمل اطاعت کے ساتھ آخرت کا عقیدہ وہ انقلابی تصور ہے جو انسان کو خیر و شر کے درمیان خیر کو منتخب کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ اور آخرت میں جواب دہی کا تصور اس کو اپنی دنیاوی زندگی میں خیر کا تابع بنائے رکھتا ہے۔ یہ تصور برائیوں سے روکتا ہے اور خیر کے کاموں میں سبقت لے جانے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

چنانچہ ایک مسلم معاشرے کی زندگی کا کوئی بھی دائرہ ہو یا کوئی بھی گوشہ یا پہلو ہو، اگر اس کی تشکیل خدا پرستی اور خدا خوفی کے جذبے اور احساس و ادراک پر رکھی جائے گی تو اس معاشرے میں نیکیاں پروان چڑھیں گی اور برائیوں کا اثر و نفوذ کم ہوجائے گا۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

"فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ"

گویا روز جزا ہر انسان کو اس کے خیر و شر کے رائی کے دانے کے برابر کا بھی بدلہ ملے گا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: "من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا"

یعنی جس شخص نے صالح عمل کیا تو اس سے اس کی ذات کو فائدہ پہنچے گا اور جس نے برا عمل اختیار کیا اس کا اثر اس کے نفس پر ضرور پڑے گا اور وہ اس کی سزا ضرور بھگتے گا۔

ذہنی مطابقت اور عملی یک رنگی:

اسلام اپنے ماننے والوں کے درمیان ایک فکری ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر افراد میں ذہنی مطابقت پائی جائے گی تو اس کے افراد معاشرے کی شکل میں ایک قوت بن کر ابھریں گے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسی کہ آپ ایک دیوار بنانا چاہیں مگر اس دیوار کی تعمیر کے لئے آپ کے پاس جو اینٹیں ہیں وہ مسالے کے مختلف توازن کے ساتھ بنی ہیں اور ان کے سائز بھی اپنی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان اینٹوں سے آپ دیوار تو یقیناً بنالیں گے مگر جو دیوار بنے گی وہ مکمل طور پر باہمی مربوط نہ ہوگی اور کمزور ہوگی۔ اس کے برخلاف ایک ایسی دیوار جس میں یکساں مسالے کے توازن اور سائز کی اینٹیں باہم ایک دوسرے سے صحیح طور پر مربوط لگائی گئی ہوں وہ پہلی دیوار کے مقابلے میں یقیناً زیادہ مستحکم اور قابل اعتبار ہوگی۔ مسلمانوں کی جماعت کو عقیدے کی ہم آہنگی اور ذہنی مطابقت کے سبب ان کے اتحاد کو "بنیانٌ مرصوص" سے تعبیر کیا گیا ہے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ ذہنی مطابقت کے سبب ان کے طریق عمل میں بھی مطابقت پیدا ہوتی ہے اور پھر انسانی تہذیب کی جو عمارت ان کی کوششوں سے تعمیر ہوگی اور معاشرہ وجود میں آئے گا وہ یقیناً صالح افراد کا قرآنی معاشرہ ہوگا۔ اس مثال کے دینے سے میری مراد یہ ہے کہ ہماری حکومت؛ ہماری دینی انجمنیں اور نظریہ پاکستان اور اسلام کی داعی جماعتیں اور ملت کا درد رکھنے والے اہل فکر اصحاب اس نکتے کو اچھی طرح محسوس کرلیں اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے معاشرے کے افراد کے درمیان باہمی ذہنی مطابقت اور فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کے کام کو نفاذ قانون اور ترویج نظام اسلامی کا ایک

لازمی حصہ سمجھیں۔

مسلم معاشرے کا اصل نصب العین :

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم معاشرے کو اس کا بھولا ہوا نصب العین یاد دلایا جائے کہ اس کی زندگی کا سراسر مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس کا ہر عمل اس کی تکمیل و تحصیل کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ وہ اگر امن و سکون راحت و اطمینان اور سربلندی چاہتا ہے تو وہ اس کے اس فکر و عمل میں پوشیدہ ہے کہ وہ کہہ اٹھے اور اس پر عمل بھی کر دکھائے " ان صلوٰتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العٰلمين" کہ میری نماز، میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب کی سب اللہ کے لئے ہے۔

نظامِ اسلام کے نفاذ سے معیّن سمت کا ادراک :

پاکستان میں اسلامی نظام کی ترویج سے معاشرے میں ایک معین سمت کا عملی ادراک پیدا ہوگا اور قوم مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رُخ پر چلنا چھوڑ دے گی اور اسلام اس کی قومی سیرت کا ایک لازمی جزو بن جائے گا۔ اس کا ایک مستقل رنگ ہوگا جس کو ہم قرآن کی زبان میں "صبغة الله " اللہ کا رنگ کہہ سکتے ہیں۔

اسلامی نظام کا ایک اہم تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہم گروہی اور فرقہ وارانہ عصبیت کے مسموم اثرات سے اپنی نوجوان نسل کو محفوظ رکھیں، کیونکہ آئندہ چل کر موجودہ نسل کو اسلامی نظام برپا کرنے کی کوششوں میں تعاون کا فریضہ انجام دینا ہے اور یہ بات خاص طور پر ہمارے علماء کرام اور سیاست دانوں کے سمجھنے کی ہے۔

اسلامی سزاؤں کی حکمت

اسلامی سزاؤں کی حکمت پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سزاؤں کے بارے میں یہ بنیادی بات عرض کردی جائے کہ اسلامی سزاؤں کو تین قسموں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک "حد" جس کی جمع حدود ہے۔ دوسری "قصاص" اور تیسری "تعزیر" ہے۔

لفظ حد کا اطلاق ان سزاؤں پر کیا جاتا ہے جو حق اللہ کی خلاف ورزی کے جرم میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعین ہیں۔ جس میں کمی بیشی یا ردو بدل کا کسی کو حق و اختیار حاصل نہیں۔

دوسری قسم "قصاص" سے ممکن اور مساوی بدلہ مراد ہے۔ جیسے جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان اور ایسی ضربات جن کا قصاص ممکن ہو۔

تیسری قسم تعزیر کہلاتی ہے۔ جس میں ان تمام جرائم کی سزائیں شامل ہیں جو حدود اور قصاص نہ ہوں۔ تعزیر دینا یا نہ دینا، یا یہ کہ کس قسم کی تعزیر دی جائے اس کا تعین جرم کی نوعیت اور پیش آمدہ حالات کے تحت خود حاکم عدالت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ماہر سماجیات کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ معاشرہ کے مصالح کے حصول اور معاشرہ سے فساد کو دفع کرنے کے لئے مصلحت عامہ کے حصول کا تقاضہ ہے کہ جرائم کے ارتکاب پر سزائیں دی جائیں اور سزاؤں کو نافذ کیا جائے

کیونکہ مجرم اپنے جرم کے ارتکاب سے انسانی معاشرہ کے افراد کے حق میں اذیت پہنچانے کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قاتل، زانی، ڈاکو، چور، اپنے فعل قتل، زنا، ڈاکہ زنی اور چوری کے ذریعہ پورے معاشرہ کو بالواسطہ اذیت میں مبتلا کرنے کا سبب ہو جاتا ہے اور ہر اس شخص کی براہِ راست اذیت کا باعث ہوتا ہے جو اس قتل، زنا، ڈاکہ زنی اور چوری سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔ اب اگر مجرم کو بغیر مناسب سزا کے آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان جرائم کا سلسلہ پھیلتا جائے گا۔ چنانچہ یہ اصول سب کے نزدیک مسلم ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی مناسب سزا ضرور ملنی چاہئے۔

شریعت اسلام کے تحت سزاؤں میں یہ حکمت رکھی گئی ہے کہ وہ سزائیں معاشرہ سے فساد کو دفع اور مصالح کے حصول کا ذریعہ بنیں۔ اسلام میں سزاؤں کی ترتیب یا فرق مراتب جرائم کے فرق مراتب پر مبنی ہے۔ اگر جرم حق اللہ یا دوسرے لفظوں میں معاشرہ کی مجموعی بہبود و مصلحت کے خلاف ہے تو سزا سخت ہے اور اگر کسی فرد کے حق کا معاملہ ہے تو سزا میں نرمی اختیار کی جاسکتی ہے۔ جس میں اس فرد یا اس کے اہل خاندان کی مرضی سے صلح یا معافی بھی داخل ہے۔

دراصل اسلامی شریعت میں قصاص یعنی بدلہ سزاؤں کی بنیاد ہے۔ لہٰذا جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا، قتل کیا جائے گا اور جو کسی کی آنکھ کو ضائع کرے گا۔ اس کی آنکھ ضائع کردی جائے گی، جو کسی کو ناجائز ضرب پہنچائے گا۔ اس کو ویسی ہی ضرب پہنچائی جائے گی۔ یہ اصول ان حقوق سے متعلق ہوگا جو شخصی یا انفرادی ہیں لیکن جو حقوق معاشرہ کے ہیں ان کی خلاف ورزی پر سزا کا پیمانہ مختلف ہے چنانچہ ایسے جرائم میں جرم کی مقدار نہیں دیکھی جاتی بلکہ جرم کی شدت اور معاشرہ پر اس کے اثرات کے تحت انکی سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے شرعی سزاؤں میں انسانوں کی حقیقی مصلحت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ یہ مصلحت حیات انسانی کے پانچ اصولوں کی جانب اشارہ

کرتی ہے:۔

۱۔ دین کی حفاظت ۲۔ نفس یعنی جان کی حفاظت ۳۔ مال کی حفاظت
۴۔ نسل کی حفاظت ۵۔ عقل کی حفاظت ۔

یہ وہ پانچ امور ہیں جن کی حفاظت کے مدعی دیگر مذاہب بھی رہے ہیں لیکن جس انداز سے اسلام ان کی حفاظت کرتا ہے وہ دوسرے ادیان و مذاہب یا نظام ہائے قوانین کے مقابلہ میں نہایت جامع اور مؤثر ہے۔

چنانچہ جو مسلمان اسلام سے منکر ہو کر مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور دین اسلام میں فتنہ و فساد برپا کرنے کے درپے ہوں ان کو قتل کر دینے کا حکم ہے، کیونکہ وہ دین اسلام کی بنیاد کو منہدم کرنے کے درپے ہیں۔ قتل عمد میں قصاص کا اس لئے حکم ہے کہ انسانی جانیں ظلم و تعدی سے محفوظ رہیں اور سزا کے ذریعہ انسانی جان کی حرمت کا احساس عام ہو جائے۔ شراب نوشی پر اسلئے سزا ہے کہ وہ عقل انسانی کو مغلوب و مفلوج کرنے کا ذریعہ ہے۔ زنا کی حرمت اس لیے ہے کہ اولاد کا نسب خلط ملط نہ ہو جس کی حیثیت خاندانی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ اور چور پر حد اس لیئے جاری کی جاتی ہے کہ وہ خفیہ طور پر لوگوں کے زیر حفاظت مال چرا لیتا ہے جس سے علاقے میں عدم تحفظ مال کا احساس عام ہو جاتا ہے۔ انہیں امن و سکون کے ساتھ راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ چنانچہ ذرا غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ مندرجہ بالا پانچ اصول دراصل پانچ انسانی مصلحتیں ہیں جن کا حصول ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ان پر یا ان میں سے کسی ایک پر دست اندازی کو سزا کے ذریعہ روکنا عین مصلحت ہے۔

شریعت کی نگاہ میں جرائم کے تعلق سے مصالح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی یا دائمی اور دوسری اضافی شریعت جن جرائم مثلاً زنا، تہمت زنا، چوری، ڈاکہ زنی پر حد یعنی مقررہ سزا جاری کرنے کا حکم کرتی ہے، وہ انسانوں کی حقیقی اور مستقل و دائمی مصلحتوں کے حصول کی حکمت کے پیش نظر ہے جو ہر زمانہ اور ہر اسلامی ملک

کے لئے ہیں ان کے اجراء میں دار اسلام کے رہنے والے مسلم و غیر مسلم شہری کی بھی تخصیص نہیں یعنی ان حدود کا اطلاق تمام شہریوں کے لئے بلا تخصیص مذہب و ملت کیا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں ان جرائم کی سزاؤں کا تعین کر دیا گیا ہے، جن کو شریعت کی اصطلاح میں "حدود" کہا جاتا ہے۔ اور جو مصلحتیں اضافی ہیں، یعنی جو زمان و مکان کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہیں ان کے حصول کے لئے تعزیر کی اصطلاح استعمال کی ہے، جسکی نوعیت اور مقدار کا فیصلہ جرم کی نوعیت اور پیش آمدہ حالات کی روشنی میں عدالت اپنی صوابدید سے خود کرے گی۔ البتہ بعض جرائم ایسے ہیں جن کی سزاؤں کا تعین احادیث نبوی اور آثار صحابہؓ کی روشنی میں اجماعاً ثابت ہے۔ ان کو بھی فقہاء امت نے حقیقی مصالح سے تعبیر کیا ہے، جیسے حدِ خمر (شراب نوشی کی سزا میں ۸۰ درے) یا قتل مرتد، کیونکہ ان کی بنیاد وہ منفعت ہے جو جماعت مسلمین کی حقیقی مصلحت کی حمایت کرتی ہے اور دائمی طور پر خیر کا ذریعہ بنتی ہے۔

اسلام سزا کے سلسلہ میں جس منفعت انسانی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ وہ مادی اور معنوی دونوں قسم کی منفعتیں ہیں۔ ان کی بنیاد حکمران کی ذاتی خواہش، میلانِ طبع یا نفرت و بیزاری کی بنا پر نہیں بلکہ عام انسانی ضرورت، منفعت اور عدل و انصاف پر مبنی ہے جو نہ صرف مجرم کے ارتکاب کردہ جرم سے مطابقت رکھتی ہے بلکہ خود اس کو یا دوسرے انسانوں کو جرم سے باز رکھنے کا موجب بھی ہوتی ہے۔

اُسوۂ ابراہیمی

"اسوہ" عربی زبان کا لفظ ہے۔ اسوہ انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے۔ خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بُری، فائدہ بخش ہو یا نقصان دہ۔ اسی لئے آیت کریمہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کہ تمہارے لئے پیغمبر خدا میں اچھا اسوہ ہے" میں اسوہ کی صفت حسنہ فرمائی گئی۔
اسوہ کے اصطلاحی معنی طریقہ کے ہیں، چنانچہ اسوۂ ابراہیمی کے معنی ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ، یعنی وہ طریقہ جس پر حضرت ابراہیمؑ قائم تھے اور جو آپ نے اپنے متبعین کے لئے بغرض پیروی چھوڑا۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے۔ "ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا" اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ ملتِ ابراہیم کی پیروی کریں، جو ابراہیم کہ خالص خدا کی طرف جھکنے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کا ذکر قرآن کریم کی ۲۵ سورتوں اور ۶۳ آیات میں آیا ہے۔ اور جن جن عنوانوں کے تحت آیا ہے ان کی تعداد بھی کثیر ہے۔ حتیٰ کہ ایک سورہ آپ کی حیثیت کو ہمہ جہت نمایاں کرنے کے لئے آپ ہی کے نام کے مضمون سے نازل کی گئی یعنی سورۃ ابراہیم۔ اس سے آپ کی جلالت شان اور انبیاء علیہم السلام میں آپ کے اعلیٰ مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا سب سے نمایاں اسوہ "توحید باری تعالیٰ" ہے۔

قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کے اثبات توحید کا ذکر خاصی تفصیل سے آیا ہے۔
حضرت ابراہیمؑ ایسی قوم کے درمیان پیدا ہوئے جو بُت پرست اور کواکب پرست تھی، وہ اپنے ہی تراشیدہ بتوں کو پوجتی تھی۔ آپ کا باپ آذر بھی بُت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو شروع ہی سے پیغمبرانہ بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی۔ بعثت کے بعد آپ نے سب سے پہلے اپنے ہی گھر سے تبلیغ دین حنیف کا آغاز فرمایا۔ قرآن کریم توحید و شرک کے ان مناظروں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے۔ اُن کی قوم کا عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت و زلیت، رزق کی کشادگی اور تنگی، خشک سالی اور قحط وغیرہ، غرض سارا نظامِ عالم کواکب کے ذاتی اوصاف کی تاثیر پر قائم ہے، اس لئے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کی پرستش ضروری ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان معبودان باطل کی پول کھولی اور ان اوہام پرستوں کو دین حنیف کی طرف دعوت دی اور حقیقت توحید کو فطری سادگی کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے واضح کیا اور اپنی ان تھک کوشش کی کہ وہ بت پرستی اور شرک سے توبہ کر کے صرف ایک اللہ کی عبادت کریں۔ مگر وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدہ سے کسی طرح باز نہ آئے۔ بالآخر اپنے دعویٰ توحید اور باطل خداؤں کی لاچاری و بے بسی کو سب سے بڑا مشاہدہ بخشنے کے لئے آپ نے چپکے سے بت خانہ میں جاکر ان تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر اپنا تبر جس سے بتوں کو توڑا تھا، رکھ کر چلے آئے۔ اس واقعہ پر ساری قوم اکٹھی ہو گئی اور ابراہیم بلائے گئے مگر ابراہیم علیہ السلام کا جواب تھا" فسئلوھم ان کانوا ینطقون " اگر یہ بت تمہارے دیوتا بولتے ہوں تو ان سے پوچھ لو اور فرمایا،

اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون

کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو، جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان دے سکتے ہیں۔ تم پر افسوس اور تمہارے ان معبودان باطل

پر بھی، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس مشاہدۂ حق کے بعد قوم تائب ہو جاتی مگر عداوت و دشمنی کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال کر ان کی دعوت اسلامی اور تبلیغ کا قصہ ہی ختم کر دیا جائے۔ بات بادشاہ وقت نمرود تک پہنچی۔ جس کو اس کی رعایا دوسرے دیوتاؤں کی طرح اپنا معبود مانتی تھی اور دوسرے دیوتاؤں کی طرح اس کی بھی پرستش کرتی تھی۔ آپؑ نمرود کے دربار میں بلائے گئے اور مناظرہ کر کے اس پر روشن کر دیا کہ ربوبیت اور الوہیت صرف اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے لیکن دیوتاؤں کی تحقیر کے جرم کی پاداش میں سب نے یہی فیصلہ کیا کہ آپ کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کو کئی روز تک مسلسل دہکایا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ دور دور تک پہنچنے لگی اور پھر آپ کو اس آگ میں پھینک دیا گیا مگر آگ کے پیدا کرنے والے اور اس کو جلانے کی تاثیر بخشنے والے نے اس آگ سے وہ تاثیر چھین لی اور وہ آگ گلزار بن گئی۔

حضرت ابراہیمؑ کی اس تمام تر جدوجہد اور آزمائش سے آپ کے اسوہ کی نمایاں ترین خصوصیت یہ سامنے آتی ہے کہ دینِ حق کی تبلیغ پر کتنی بھی دشواریاں حائل ہوں، عداوت و دشمنی کی کتنی ہی آوازیں اور نعرے بلند ہوں، نفرت و حقارت کے کتنے ہی شعلے دہکیں، کتنی ہی خوفناک سزائیں مقرر ہوں، شرک کی قوتیں کتنی ہی زورآور ہوں، حق کی آواز بلند کرنے کے لئے خوف و خطر اور خدشۂ ملامت سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ ہی کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لئے جسم و جان کی تمام تر توانائیاں وقف کر دینی چاہئیں اور ذی اقتدار اور با اختیار حکمرانوں کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ حق کا اظہار کرنا چاہیے اور عزم و استقامت کا ثبوت دیتے رہنا چاہیے اور کسی طرح طاغوتی طاقتوں کے سامنے سر خم نہ کرنا چاہیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دوسرا اسوہ بحکم خداوندی حضرت اسماعیلؑ کا ختنہ کرانا ہے یہ رسم ختنہ اب بھی ملتِ ابراہیمؑ کا شعار ہے اور سنتِ ابراہیمی کے

نام سے مشہور ہے۔

حضرت ابراہیم کا تیسرا اسوہ ذبح عظیم ہے جو تسلیم و رضا کا بے نظیر و بے مثال نمونہ ہے کہ بحکم الٰہی اپنے پیارے بیٹے اسماعیل کو خدا کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ و مستعد ہیں۔ بیٹے کا سر تسلیم بھی خم ہے۔ باپ بیٹے جنگل میں پہنچے۔ باپ نے بیٹے کی مرضی پاکر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھی کہ شفقتِ پدری اللہ کے حکم پر غالب نہ آجائے۔ بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے کہ ہاتف غیبی کی آواز آئی۔ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، بے شک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش ہے، اب بیٹے کو چھوڑ اور اس مینڈھے کو جو تیرے سامنے ہے، اپنے بیٹے کے بدلے ذبح کر ہم نیکو کاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس مینڈھے کو ذبح کر دیا۔ یہی وہ "قربانی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار ہمیشہ کیلئے ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ شعار اسی طرح منایا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک اور بڑا اسوہ حج بیت اللہ ہے۔ آپ بحکم الٰہی کعبۃ اللہ کے بانی ہوسس اور معمار ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری (شرح بخاری) میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکہ نے ان کو وہ مقام بتا دیا تھا۔ جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اسکو بے نشان کر دیا تھا البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھی۔ یہی وہ مقام ہے جسکو وحی الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انہوں نے اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے اس کو کھودنا شروع کیا تو سالوں تعمیر کی بنیادیں نظر آگئیں، انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی۔ ؎

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"اِنّ اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین"

دنیا میں سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا ، البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے وہ سرتا پا برکت اور تمام جہان والوں کیلئے سرچشمۂ ہدایت ہے ۔ جو خداوندی پرستش اور اس کی وحدانیت کے اقرار میں سرِ نیاز جھکانے کے لئے بنایا گیا ۔

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ نے اپنی بیش بہا تصنیف "ارض القرآن (ص ۴۳ - ۲۴۲) میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس کعبۃ اللہ کے معمار اور اسمٰعیلؑ مزدور ۔ اٹھا اٹھا کر پتھر لاتے ہیں اور باپ کو دیتے ہیں جو اوپر تلے رکھتے جاتے ہیں اور کعبہ کی دیواریں بلند ہوتی جاتی ہیں اور جب اسکا ہاتھ اوپر نہیں پہنچتا تو بہ توفیق ایزدی ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے ، جس کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام اس پہ چڑھکر تعمیر کرتے جاتے ہیں ۔ یہی وہ یادگار ہے جو "مقام ابراہیم" کے نام سے موسوم ہے ۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے " واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی " اور حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ نماز کی جگہ بنائی جائے ۔ چنانچہ طوافِ کعبہ کے بعد دو رکعت نفل نماز مقام ابراہیم میں پڑھنا سنت ہے اور شاید ایک بھی طواف کرنے والا ایسا نہ ہو جو اس مقام پر نماز پڑھنے سے محروم رہا ہو ۔

جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں اب حجر اسود نصب ہے تو جبرئیل امین نے ان کی راہنمائی کی اور حجر اسود کو جو ایک پہاڑی میں محفوظ تھا ۔ ان کے سامنے نکال کر دیا ۔ (جسکو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے) ، نصب کر دیا گیا اور امت کیلئے اس حجر اسود کو بوسہ دینا حج و عمرہ کا شعار قرار پایا ۔

کعبہ تعمیر ہو گیا تو بحکم الٰہی ملتِ ابراہیمی کیلئے قبلہ اور اللہ کی بارگاہ میں جھکنے کا نشان مرکزِ توحید قرار پایا ، چنانچہ ہر سال ذی الحجہ میں دنیا کے گوشے گوشے سے لاکھوں فرزندانِ توحید اس مرکز پر جمع ہوتے ہیں اور دین و دنیا کی سعادتوں سے اپنے دامن بھرتے ہیں ۔

۱

اصلاحِ معاشرہ

انسان جس معاشرے میں رہتا ہے یقیناً اس کی اصلاح کا فریضہ بھی خود اسی پر عائد ہوتا ہے۔ گو اصول یہی ہے کہ ہر فرد اپنے افعال کا خود ذمہ دار اور جوابدہ ہے لیکن معاشرہ کے جو افراد نہ صرف خود با اختیار ہیں بلکہ بعض دوسرے افراد پر بھی بعض اعتبار سے اختیار رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری دہری ہو جاتی ہے۔ ایک خود اپنی ذات کے بارے میں اور دوسری متعلقہ افراد کے تعلق سے، مثال کے طور پر والدین اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کی اصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ ایک حاکم اپنی رعایا کے عام اخلاق کی درستی اور اصلاح و تربیت کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے:۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔

کہ تم میں سے ہر ایک گلہ بان یعنی نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک جوابدہ ہے اپنے گلہ کے بارے میں۔

اسلام معاشرے کی اصلاح کو دو دائروں میں بیان کرتا ہے، ایک انفرادی سطح پر اور دوسرے اجتماعی۔ چنانچہ اگر ایک طرف انسان کے ذمہ خود اپنی اصلاح ہے تو دوسری طرف اس کے ذمہ معاشرہ کے دیگر افراد کی اصلاح کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے البتہ ایک خاص دائرہ میں یہ فریضہ مسلمانوں کے ایک گروہ کے سپرد ہے کہ وہ "داعی الی الخیر" بن کر لوگوں کو خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ان کی اصلاح و تربیت کے کام میں مشغول ہے۔

اسلام، توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت کو اصلاح معاشرہ کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ خاص طور پر عقیدۂ آخرت انسان کے دنیاوی اعمال و افعال پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی اور نظریہ یا عقیدہ نہیں کر سکتا چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا۔

جس نے نیک کام کیا تو اس کا فائدہ اسی کے اپنے لئے ہے اور جس کسی نے برائی کی وہ خود اس کے آگے آئے گی۔

آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل کی بنیاد اور اصلاح معاشرہ کے لئے تریاق کا کام کرتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے صرف یہی دنیا اصل مقصود ہے اور ان کے پاس آخرت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے

ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کے مصداق وہ اس چند روزہ حیات کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ آخرت کی جزا و سزا کا کوئی تصور ان کے یہاں موجود نہیں، وہ جھوٹ اور سچ، حرام اور حلال کی تفریق کو اپنے شب و روز کے عیش و آرام میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو ان کو معاشرتی برائیوں اور اخلاقی جرائم کے ارتکاب سے باز رکھنے والی کوئی شے نظر نہیں آتی اور اگر وہ کسی وقت ان برائیوں اور جرائم کے ارتکاب سے رکے رہتے ہیں تو ایسا حکومت کے تعزیری قوانین یا سوسائٹی کے دباؤ کے تحت ہوتا ہے لیکن:۔

ع چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر مے کنند

خلوتوں، اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور پولیس کا انہیں کوئی خدشہ نہیں ہے انہیں کون سا امر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام اور مالی مفادات اور مادی منافع کو چھوڑ کر اخلاقی قدروں اور ضابطوں کی پابندی قبول کریں، وہ صرف عقیدہ آخرت اور اللہ کا خوف ہی ہو سکتا ہے جو انسان کو اس کے ظاہر و باطن میں یکساں اخلاقی عمل اختیار کرنے پر اس کے قلب و ضمیر کو ہمہ وقت آمادہ و تیار رکھتا ہے۔

اس کیفیت کو اس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص تن تنہا ایک جنگل میں جا رہا ہے کہ راستے میں اسے ایک تھیلی پڑی ملی ہے۔ وہ اٹھا لیتا ہے۔ کھول کر دیکھتا ہے کہ وہ کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے آس پاس کوئی فرد بشر موجود نہیں جو اس فعل کا گواہ ہو۔ تھیلی پر مالک کا پتہ بھی لکھا ہے لیکن وہ خدا فراموش شخص اس تھیلی کو اٹھا کر خوشی خوشی اپنے گھر لے جاتا ہے اور خوب گل چھرے اڑاتا ہے اس کے برخلاف عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص جو اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام کاموں سے واقف ہے۔ وہ ہماری تمام حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے، اس نے ہمارے تمام افعال کے لکھنے کے لئے کراماً کاتبین مقرر کر رکھے ہیں جو ہمارے ہر ہر عمل کو لکھ رہے ہیں۔ ایسا شخص یا تو اس تھیلی کو وہیں پڑا رہنے دے گا یا اس کے مالک کو تلاش کر کے اس تک اس تھیلی کو پہنچا دے گا یا حکومت کے پاس جمع کرا دے گا۔ ان دونوں اشخاص کے درمیان نقطۂ امتیاز صرف عقیدۂ آخرت پر کامل ایمان ہے، یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پوری طرح عمل کرنے سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آیا کہ لوگ مسلمانوں کی صورتیں اور چال چلن دیکھ کر دل و جان سے ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

اسلام معاشرے کی اصلاح کے لئے علم دین کو عام کرنے پر خاص زور دیتا ہے کیونکہ دین کا اصل مقصد بندہ اور اللہ کے درمیان تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا ہے جس پر انسان کی عملی زندگی کے استحکام کا دارومدار ہے۔ اسلام صحیح سمت میں فرد میں جذبۂ عمل کو بیدار کر کے یہ احساس اجاگر کرتا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے معاشرے کے دوسرے افراد کو تکلیف نہ پہنچائے، دوسروں کے حقوق غصب نہ کرے، دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے نہ دائر کرے، جھوٹی گواہی نہ دے اللہ اور اس کے رسول برحق کے فرمان کے خلاف حرام مال کھانے میں نہ لگے، دنیا کے ذلیل اور پست مقاصد کے حصول کے لئے شریعت کے خلاف طریقے اختیار نہ کرے۔

اسلام ایمان و عمل کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے ۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے ورنہ ناقص رہتا ہے ایمان و عمل کا یہ التزام معاشرے کی پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے ۔

اصلاح معاشرہ کے لئے اسلام جس چیز پر زیادہ زور دیتا ہے ۔ وہ قول و فعل میں توافق (موافقت) و مطابقت ہے ۔ فی زمانہ ہمارے یہاں اصلاح معاشرہ کی جو کوششیں کی جاتی ہیں ۔ ان کی ناکامی یا بہت کم کامیابی کی ایک خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے قول و فعل میں مطابقت نہیں ہوتی ۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ حکیم تنبیہہ کرتا ہے کہ تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے ۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :-

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔

(ترجمہ) اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ۔ ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ۔ ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے مسلمان بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو ۔

اصلاح معاشرہ کے لئے ایک اور اصول قرآن حکیم میں یہ بیان ہوتا ہے کہ لوگوں کو خیر خواہی کے جذبہ اور مَوْعِظَۃً حَسَنَۃً اچھی نصیحت کے ساتھ سمجھاؤ ۔ انہیں اصلاح حال کی طرف راغب اور متوجہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ اچھے طریقہ پر دلیلیں قائم کرو اور بحث کرو ، کیونکہ کج بحثی اور کٹ حجتی سے بجائے فائدہ پہنچنے کے الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے ۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے لَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ اپنے آپ پر نہ اتراؤ کہ بڑے متقی اور پرہیزگار ہیں ، بڑے مصلح اور ہدایت یافتہ ہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی خیر کا محتاج سمجھنا چاہیئے اور اپنے نفس کو بھی خبر کی

تلقین کرتے رہنا چاہیے۔ مبادا شیطان نفس کو غرور میں مبتلا کردے اور خیر کی توفیق ہی سلب ہو جائے۔

مقصود یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو دائروں میں اصلاح معاشرہ کے کام میں مشغول رہا جائے اس کے لئے اگر علیحدہ وقت نہ مل سکے تو جس کام اور پیشے کے متعلق ہے اس میں خیر و اصلاح کے پہلو نکال کر نیکیوں کو پھیلاتا رہے، اللہ برکت دینے والا ہے۔ چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اصلاح معاشرہ کیلئے اگر ان قرآنی ہدایات پر عمل کیا جائے اور خود کو بھی لوگوں کے سامنے عملی نمونہ بنا کر پیش کیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے اچھے اور مفید اثرات مرتب ہوں گے اور اصلاح معاشرے کا کام مستحکم بنیاد اختیار کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکمل پیروی

اسلام ایک ایسے دین کا نام ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کی صورت گری کرتا ہے۔ یہ صورت گری اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکمل پیروی کے ذریعہ ممکن ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:
"یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ" اے ایمان والو! اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ۔ اس کے معنی ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو داخل کرو۔ اسلام سے راہنمائی حاصل کرو، خالص اسلام کو قبول کرو۔ یہ نہیں کہ زندگی کے ایک شعبے میں اسلام اختیار کیا جائے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کا پرتو نظر آئے یا زندگی کے دوسرے شعبے لادینی نظریات کے سپرد کر دیئے جائیں۔

اس حکم کا منشاء یہ ہے کہ اسلام پر ایمان و عمل کے لئے نہ کوئی استثناء ہو اور نہ کوئی ذہنی تحفظ (MENTAL RESERVATION) بلکہ پوری کی پوری زندگی اسلام کے تحت لے آؤ۔ خیالات و نظریات، اعمال و افکار، علوم و فنون، طور و طریق، عبادات و معاملات، سعی و عمل اور کسب معاش غرض زندگی کے تمام راستے اسلام کی طرف جاتے ہوں۔ یہ نہیں کہ زندگی کی وحدت کو انفرادی اور اجتماعی یا پرائیویٹ اور پبلک، علمی اور عملی، سرکاری و غیر سرکاری، کاروباری اور غیر کاروباری دائروں اور خانوں میں تقسیم کر کے کچھ خود ساختہ اصول وضع کر لو اور کہو کہ اسلام میرا مذہب ہے اور چوری میرا پیشہ، اسلام میرا مذہب ہے

اور سرمایہ داری میری معیشت، اسلام میرا مذہب ہے اور غیر شورائی نظام میرا اصول حکومت، اسلام میرا مذہب ہے اور سودی لین دین میرا کاروبار، اسلام میرا مذہب ہے اور رشوت میری ضرورت، اسلام میرا مذہب ہے اور جھوٹ اور سازش میری سیاست، اسلام میرا مذہب ہے اور ملاوٹ میری تجارت ــ یہ سب شیطانی خیال، واہمے اور وسوسے ہیں جو ہمیں اسلام کی پیروی سے دور اور شیطانی راستے کے قریب کر دیتے ہیں۔ شیطان ان راستوں کو جن پر وہ انسانوں کو چلانا چاہتا ہے، مزیّن اور آراستہ کر کے دکھاتا ہے اور اس میں لوگوں کو بہت سے منافع اور مصلحتیں نظر آتی ہیں، حالانکہ وہ ظاہرا منافع اور مصلحتیں اپنے اندر شر لئے ہوئے ہوتی ہیں جو انسان کی عاقبت تو یقیناً خراب کر دیتی ہیں۔

ایمان لانے کے بعد اسلام کے احکام پر عمل کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اسلام کامل فرض ہے، آدھا یا چوتھائی اسلام نہیں۔ یعنی اسلام کے جملہ احکام کی رعایت کی جائے جو حکم فرض ہے اس کو فرض کے درجے میں مانا جائے اور جو واجب ہو اس کو واجب کے درجے میں اور جو سنت ہے اس کو سنت کے درجوں میں اور جو مستحب اور پسندیدہ ہے اس کو مستحب اور پسندیدہ کے درجے میں۔ اسی طرح جو اعمال اور افعال حرام اور ممنوع ہیں ان کو حرام اور ممنوع ماننا چاہیئے اور جو مکروہ ہیں ان کو مکروہ تسلیم کیا جائے۔ پھر کراہت میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک تو وہ مکروہ ہیں جو بہ لحاظ تقویٰ اور بہ نظر احتیاط مکروہ ہیں۔ اس کو "مکروہ تنزیہی" کہتے ہیں اور دوسرا مکروہ وہ ہے جو اپنے اثر کراہت میں حرام کے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا اثر ممنوع ہی ہوتا ہے اگر وہ حرام سے کم درجے میں ہو اس کو "مکروہ تحریمی" کہتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کس طرح کریں؟ اس کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کا صحیح علم، ضروری طریقہ پر حاصل کیا جائے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علامہ شاطبی

نے اپنی تصنیفات میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ علم صحیح عمل کو مستلزم ہے۔ یعنی صحیح علم کا نتیجہ اور اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ عمل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بالخصوص وہ علم جو تصدیقی ہو۔ چنانچہ جو شخص علم صحیح کے ذریعہ پختہ یقین و تصدیق کے ساتھ ایمان لاتا ہے اس کا ذہن احکام کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتا ہے۔ اس میں طاقت حق اور عمل صحیح کی قوت بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے اور جو لوگ علم صحیح کی دولت سے محروم ہوں گے، ان کے عمل میں ایک عادت تو ضرور ہوگی مگر وہ پختگی نہ ہوگی جو یقین کا نتیجہ ہوتی ہے۔ گویا عمل کے لئے علم دین کے حصول کی طرف سے غفلت اور بے حسی ہے، جو کچھ تھوڑی بہت دینی معلومات بوجہ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے کے ہم کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ راہ عمل میں ناکافی اور ناقص ہونے کے سبب عمل میں پختگی اور استقامت پیدا کرنے میں عموماً ناکام رہتی ہیں۔ یا یوں کہیے کہ دین کے جس شعبے یا پہلو سے متعلق انہیں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں اس حد تک عمل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ احکام الٰہی کی پوری اور مکمل پیروی بلا علم صحیح ممکن نہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکام کی مکمل پیروی کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اللہ تعالیٰ کے کیا احکام ہیں اس کے لئے قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ہم روزانہ ایک گھنٹہ بھی قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے میں صرف کریں تو اس زندگی اور اس کے گوناگوں معاملات کے بارے میں ہمارے دینی رویے میں یقیناً اچھی تبدیلی آئے گی۔ اور جوں جوں ہمارا دینی علم بڑھتا جائے گا دین سے ہماری محبت بڑھتی جائے گی جو بالآخر عمل میں آسانی اور سہولت پیدا کرنے کی موجب ہوگی۔

دین کے بارے میں علم صحیح کے ساتھ ایسے اہل اللہ جو قرآن و حدیث کے عالم اور شریعت کے سختی کے ساتھ پیرو ہوں، ان کی صحبت میں کچھ وقت گزارنا بھی عمل میں سہولت اور ہمت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے اور جن

طبیعتوں میں جیسی جیسی صلاحیت ہوتی ہے اسی اعتبار سے ان کی دینی حالت احکام الٰہی پر عمل کے تعلق سے ترقی کرتی جاتی ہے۔ وہ دو طریقے ایجابی ہیں جو اللہ اور رسول اللہ کے احکام پر عمل کی توفیق بخشنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ سلبی طریقے بھی ہیں۔ چنانچہ جس طرح کسی درخت میں پھل لانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بیج عمدہ ہو، خراب نہ ہو، یہ بات کسی بھی درخت کی بارآوری کے لیے اہمیت رکھتی ہے اسی طرح احکامِ الٰہی پر عمل کیلئے تخم ایمان کی اہمیت بنیادی امر ہوتا ہے کہ ہمارے دلوں میں اللہ کی وحدانیت، ربوبیت، خلاقیت اور رزاقی کے بارے میں پختہ یقین ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے آخری اور مکمل اور جامع کتاب ہدایت ہونے پر ایمان کامل ہو۔ ایمان کی حیثیت تخم کی سی ہے۔ جس طرح تخم کو زمین میں ڈال دینے کے بعد ہم اس کی آبیاری کرتے ہیں، مناسب مقدار اور مقررہ اوقات میں اس کو پانی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں اسی طرح ایمان کے قوت اور جڑ پکڑنے کے لئے اور عمل میں اس کے اظہار کے لئے علم دین کے حصول کی ضرورت ہے علم کے بغیر ایمان کے پودے میں جو آپ نے قلب میں لگایا ہے کونپل نہیں پھوٹے گی اور اس کا صحیح عملی مظاہرہ نہ ہو سکے گا۔ خواہ وہ مظاہرہ عبادت کی شکل میں ہو یا معاملات میں ہو۔

جس طرح درخت کی تخم ریزی اور آبیاری کے بعد اس امر کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس ننھے پودے پر کسی تناور درخت کا سایہ تو نہیں پڑ رہا ہے یا اس کے پاس کچھ ایسے پودے تو نہیں ہیں جو اندر ہی اندر اس ننھے پودے کو بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس درخت یا پودوں کو اس مقام سے اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ اور ان رکاوٹوں کو دور کر دیا جاتا ہے۔ یا خود اس ننھے پودے کی جگہ تبدیل کر دی جاتی ہے، بالکل یہی صورت ایمان کی ہوتی ہے اس کو آس پاس کے برے ماحول سے بچائے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تا آنکہ وہ خوب جڑ پکڑ جائے اور ضروری

قوت و استعداد حاصل کرے اور آس پاس کے اثرات سے مغلوب ہونے کی بجائے غالب ہونے کی قوت اس میں پیدا ہو جائے۔ اور آخری بات یہ دیکھنا ہوتی ہے کہ اس ننھے پودے کو کوئی کیڑا یا بیماری ایسی تو نہیں لگ گئی جو اندر ہی اندر اس کی جڑ کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کو دور کرنے کی طرف فوری اور پوری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ شجر کاری کی تمام محنت برباد ہو جاتی ہے، ان تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے اور اس تخم یا پودے پر ایجابی اور سلبی دونوں طرح محنت کرنے کے بعد وہ ننھا پودا ایک جاندار درخت بن کر ابھرتا ہے اور کچھ ہی عرصے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ درخت پھلوں سے لدا پھندا ہمارے سامنے ہے اور ہم سب اس سے آرام اور لذت حاصل کرتے ہیں، اسی طرح شجر ایمان کی آبیاری اور آس پاس کے ماحول سے بچاؤ کے ساتھ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمانے کے جھوٹے اور فاسد خیالات و نظریات جو ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں پر زہریلے اثرات پیدا کر رہے ہیں ان کے سد باب کیلئے کیا تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

غرض اس طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم حاصل ہونے کے بعد ان کی پیروی کا جذبہ پیدا ہو گا اور انشاء اللہ ہماری حیثیت ان لوگوں کی نہ ہو گی جن کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ تم کتاب اللہ کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو یہ کیا بات ہے؟

امانت میں خیانت

عام طور پر امانت کا لفظ اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو امین کے پاس رکھی جائے۔ چاہے وہ چیز کسی حفاظت کیلئے اس کو دی گئی ہو یا کسی دوسرے معاملہ کی وجہ سے اسے سونپی جائے یا کسی کے قبضہ میں کوئی شئے بطور امانت بغیر کسی معاملہ اور ارادے کے آجائے جیسے آندھی میں پڑوسی کا کوئی کپڑا یا چیز اڑ کر آجائے یا راستہ میں پڑی ہوئی کسی کی کوئی چیز ہاتھ آجائے۔

لیکن قرآنی مفہوم میں امانت کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعتیں رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں امانت کا ذکر چھ آیتوں میں آیا ہے۔ یہ چھ آیتیں سورۂ بقرہ، سورۂ النساء، سورۂ انفال، سورۂ مومنون، سورۂ احزاب اور سورۂ معارج میں آئی ہیں۔ ان آیات کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پہلے "امانت" کا مجموعی یا مکمل تصور دیتا ہے اور پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے عام معنی بھی سمجھاتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم پہلے "ایمان و ہدایت کو امانت کا بیج" کہتا ہے جو اللہ کی طرف سے انسان کے دل میں بو یا گیا ہے۔ اور انسان کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ ایمان و ہدایت کے اس بیج کو جو اللہ کی امانت ہے ضائع نہ ہونے دے۔ سورۂ احزاب میں "انا عرضنا الامانة على السمٰوات والارض والجبال" میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جس کی تائید حضرت حذیفہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا "ان الامانة نزلت من السماء فی جذر قلوب الرجال

ثم علموا من القرآن" یہ امانت دراصل تخم ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے لوگوں کے دلوں کی تہہ میں بٹھایا گیا، پھر قرآن و سنت کے فیضان کی بارش سے یہ تخم زمین قلب میں جڑ پکڑ کر ہدایت و ایمان کا ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے انسان صحیح معنی میں زمین میں اللہ کا نائب کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

امانت کے اس بنیادی قرآنی مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے سورۂ انفال کی اس آیت پر غور کیجیے۔ فرمایا گیا "یاایھا الذین آمنوا لاتخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون" اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو۔ خدا اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے۔ ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ تم اپنی امانتوں میں خیانت کرتے ہو حالانکہ جانتے ہو، یعنی جانتے بوجھتے ہوئے امانت میں خیانت کرتے ہو۔ اس آیت میں ہر قسم کے حقوق اللہ اور حقوق العباد آ گئے۔ یہ امانت کا اہم اور جامع مفہوم ہے جو قرآن پاک ہم کو دیتا ہے کہ انسان کے پاس جتنی قوتیں ہیں وہ سب اللہ کی امانت ہیں خواہ وہ قوتیں روحانی و فکری ہوں یا مادی و جسمانی۔ ان سب قوتوں کو اسی کے بتلائے ہوئے طریقوں اور مواقع پر خرچ کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی کا نوکر ہے۔ کام کا وقت اور معاوضہ مقرر ہے۔ اب وہ وقت اس کے پاس امانت ہے۔ اگر وہ اس وقت میں مالک کا کام نہیں کرتا تو گویا امانت میں خیانت کرتا ہے یا مثال کے طور پر ایک جج یا حاکم کو جو منصب ملا ہے۔ وہ اس کے پاس امانت ہے اگر وہ اس منصب اور اختیار کے تقاضے دیانتداری کے ساتھ پورے نہیں کرتا تو وہ لوگوں کے حقوق میں خیانت کرتا ہے اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں اور اختیار کو صحیح طریقہ پہ کام میں نہ لا کر یا غلط طریقہ پہ کام کر کے حقوق اللہ میں بھی خیانت کرتا ہے۔

قرآن حکیم امانت کے اس جامع اور کلی مفہوم کے بعد امانت کے اس عام معنی کا بھی ذکر کرتا ہے جس کا تجربہ زندگی میں آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ امانت انسانی کردار کا بنیادی جوہر ہے۔ قرآن پاک امانت کو مومن کی صفات میں سے ایک اہم صفت

قرار دیتا ہے ۔ سورۂ مومنون اور سورۂ معارج میں صفات مومنین کے تحت ارشاد ہوتا ہے ۔" والذین ھم لامانٰتھم وعہدھم راعون " کہ کامیاب و کامران مومن وہ ہے جو (دوسری صفات کے علاوہ) یہ صفت بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی امانتوں سے اور اپنے عہد اور وعدوں سے خبردار اور ان پر قائم رہتے ہیں اور اپنے معاملات میں امانتوں کے ادا کر دینے اور قول و قرار کے پورا کرنے کا پورا لحاظ رکھتے ہیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔" لا ایمان لمن لا امانۃ لہ " جس میں امانت نہیں اس کے پاس ایمان نہیں اور پھر صاف الفاظ میں حکم دیا جا رہا ہے ۔" ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا " کہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کے پاس ۔ قرآن حکیم سورۂ انفال میں امانتوں میں خیانت نہ کرنے کے ساتھ ہی خبردار کرتا ہے ۔" واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ " اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد خرابی ڈالنے والے ہیں چونکہ مال اولاد کی خاطر آدمی اکثر بے ایمانیاں کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق دبا لیتا ہے ۔ اس لئے اس سے بچنے کے انعام پر توجہ دلائی گئی ہے کہ " وان اللہ عندہ اجر عظیم " امانتداری کا جو صلہ اللہ کے ہاں ہے وہ دنیاوی مال واولاد وغیرہ سب سے بڑھ کر ہے ۔ چنانچہ تاکید کی گئی ہے کہ تم اپنا بھلا چاہتے ہو تو " فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ ولیتق اللہ ربہ " چاہیئے کہ ادا کرے پورا وہ شخص جس پر امانت کے بارے میں اعتبار کیا گیا اور چاہیئے کہ خیانت کے وقت ڈرے اپنے رب سے ۔

ایمان کی دُنیاوی برکات

ایمان کی دنیاوی برکات کے موضوع پر گفتگو کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ایمان کے بارے میں کچھ جان لیں۔

ایمان کا لفظ "امن" سے ماخوذ ہے۔ اور امن خوف کی ضد ہے، لہٰذا ایمان کے معنی ہوئے ازالۂ خوف، یعنی طمانیت، اطمینان ـــــ لیکن یہ معنی اس وقت ہوں گے جب یہ لفظ صلہ کے بغیر متعدی بنفسہ ہو اور جب اس کا صلہ "با" آئے تو اس کے معنی تصدیق کے ہوں گے جیسے "آمنت باللّٰہ" ـــــ ایمان لایا میں اللہ پر۔

شریعت نے ایمان کو تصدیق کے معنی میں اختیار کیا ہے اور تصدیق کے لئے بھی شرعی تصدیق مراد ہے۔ محض لغوی یا منطقی تصدیق مقصود نہیں۔ چنانچہ ایمان کے شرعی معنی ہیں۔

هو التصديقُ بما عُلِمَ بمجيئِ الرسول و اجمالاً فيما عُلِمَ اجمالاً وتفصيلاً فيما علم تفصيلاً۔

بعض چیزوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لانے کا واضح طور پر علم ہو جائے تو اجمالی چیزوں کی اجمالاً اور تفصیلی چیزوں کی تفصیل کے ساتھ تصدیق کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔ یعنی جس چیز کے بارے میں اس [illegible] حاصل ہو جائے کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اس کو زبان سے سچا قرار دینا اور دل سے سچا ماننا ـــــ مثلاً خدا

کو وحدہ لاشریک لہ ماننا، اس کے سوا کسی کو عبادت کے لائق قرار نہ دینا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی ماننا، نماز، زکواۃ، روزہ اور حج کو اسلام کے ارکان کی حیثیت سے ماننا۔ عذابِ قبر، مرنے کے بعد روزِ قیامت اور دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا کو سچا سمجھنا اور ماننا وغیرہ —— یہ تصدیق جس امر کے بارے میں تفصیلاً آئی ہے، اس کو تفصیل کے ساتھ اور جس امر کے بارے میں اجمالاً آئی ہے۔ اس کو اجمال کے ساتھ ماننا ضروری ہے۔

امام رازی اور امام غزالی رحمتہ اللہ علیہما نے ایمان کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ ایمان محض معرفت و تصدیق کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان میں وہ معرفت و تصدیق معتبر ہے جس کے ساتھ کلام نفسی اور قول قلب بھی ہو جو اس معرفت و تصدیق والے کے دل میں پیدا ہو گویا اقرار باللسان کی طرح اقرار بالقلب بھی ہو۔ لیکن ایمان کی سب سے اچھی تعبیر علامہ شیخ ابن ہمام نے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ایمان نام ہے معرفت و تصدیق کے ساتھ استسلام قلبی اور انقیاد باطنی کا یعنی مومن وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا نبی جان لینے، پہچان لینے اور مان لینے کے بعد ظاہر اور باطن میں ان کا مطیع و فرمانبردار ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی رسّی کو اپنی گردن میں ڈال لے اور اپنے اوپر لازم کرلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جدھر جائیں گے ادھر ہی چلوں گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے "الایمان ھو الاقرار باللسان والتصدیق بالقلب والعمل بالجنان" کہ ایمان نام ہے زبان سے اقرار کا اور دل سے تصدیق کا اور اعضاء سے عمل کا۔

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جس طرح تصدیق ایمان کا جزو ہے، کیا اطاعت و انقیاد بھی ایمان کا جزو ہے یا یہ ایمان کی شرط ہے۔ بہرحال صحیح تحقیق یہ ہے کہ نفس اطاعت والتزام، تحقیق ایمان کے لئے ضروری ہے اور ہمیشہ اسی انقیاد والتزام کے مطابق عمل کرتے رہنا، یہ دوسری چیز ہے معصیت کا ارتکاب مومن کو دائرہ ایمان و اسلام سے خارج نہیں کرتا۔ بشرطیکہ وہ معصیت ایسی نہ ہو جو خود تصدیق

ہی کے فوت ہو جانے پر دلالت کرے۔

ایمان کے بارے میں ان مختصر ارشارات کے بعد آیئے ایمان کی برکات پر غور کریں۔ ایمان کی برکات دنیاوی بھی ہیں اور اخروی بھی۔ اس وقت اخروی برکات ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہیں اس لئے ہم صرف دنیاوی برکات پر گفتگو کریں گے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنی شہادت۔ اللہ تعالیٰ سورت نور میں ارشاد فرماتا ہے:۔

وعد اللّٰہُ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنّہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم۔

کہ اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح کئے کہ اللہ تعالیٰ ضرور ان کو خلیفہ کرے گا، زمین میں، جیسا کہ خلیفہ کیا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے ——

اور سورۃ عصر میں ارشاد ہوتا ہے:۔

والعصر ان الانسان لفی خسر، الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت۔

قسم ہے زمانہ کی، تحقیق انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے۔

گویا یہ قرآنی اعلان ہے کہ انسانی زندگی میں صرف ایمان اور عمل صالح ہی نفع و برکت کا سبب ہے اور یہ قرآنی وعدہ ہے کہ جو لوگ صاحب ایمان ہوں گے اور عمل صالح کریں گے، وہ بالآخر اس روئے زمین کے خلیفہ یعنی حاکم ارضی بنائے جائیں گے اور اس وقت تک کے لئے نادر برکتیں ان کے قبضہ میں دے دی جائیں گی۔

اور یوں بھی یہ بات ماہرین عمرانیات اور نفسیات کے نزدیک مسلم ہے کہ انسان کے افعال و اعمال کا اصل محرک اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ اگر خیالات صالح

ہیں تو ان کے زیرِ اثر جو افعال سرزد ہوں گے وہ بھی نیک اور صالح ہوں گے اور اگر خیالات بُرے اور فاسد ہوں گے تو افعال اور اعمال بھی برائی آور ہوں گے۔
اور اگر یہ بات بھی ہم سب کو تسلیم ہے کہ خیالات کا مبدا اور سرچشمہ دراصل اس کے عقائد ہوتے ہیں جن کے تحت اس کے خیالات و تصورات تشکیل پاتے ہیں اب اگر عقیدہ صالح اور ہمہ گیر ہو تو اس کی زندگی کے افعال و اعمال اس عقیدہ کے زیرِ اثر وقوع پذیر ہوں گے۔
ایمان کا بنیادی نقطہ اللہ کے وجود کو اس کی تمام صفات کے ساتھ تسلیم کرنا، احکم الحاکمین ماننا اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری پیغمبر ماننا اور عملاً آپ کے دین کو اپنی ساری زندگی میں جاری و ساری کرنا ہے۔ اللہ کو احکم الحاکمین ماننے والا شخص کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا، اللہ کو قادرِ مطلق ماننے والا شخص کسی شخص کو نفع و ضرر کا مالک نہیں سمجھتا۔ اللہ کو رزاقِ حقیقی ماننے والا شخص یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں کوئی ذی روح ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ ایمان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا اور آخری نبی ماننے والا آپ کو ایک ماڈل اور نمونہ سمجھتا ہے اور اپنی زندگی آپ ہی کے بتائے ہوئے طریقہ پر گزار کر دنیاوی برکات و حسنات حاصل کرتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ نماز کو قائم کرنا، صفائی، طہارت، پاکیزگی اور وقت کی قدر و پابندی کے علاوہ ماسوا اللہ، ہر ایک کی عبادت و بندگی کی نفی کرتا ہے۔ زکوٰۃ کے نظام کو اپنا کر حبِ مال کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ باہمی ہمدردی اور ضرورتمندوں کی مدد کے جذبۂ عمل کو پروان چڑھاتا ہے۔ اور روزہ دوسروں کی غربت اور بھوک کا احساس دلاتا ہے اور ایمان کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ ایمان کامل انسان کو اس دنیاوی زندگی میں معصیت و گناہ سے بچاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص گناہ و معصیت سے بچتا ہے۔ اس کی یہ دنیاوی زندگی امن و عافیت کا گہوارہ ہوتی ہے اور دنیا میں انسانی زندگی کیلئے جو مضر چیزیں ہیں وہ ان سے محفوظ رہتا ہے اور اللہ کی قائم کردہ حلال و

حرام کی حدود کو قائم رکھ کر اس دنیا میں نفس مطمئنہ حاصل کرتا ہے وہ ایمان کی روشنی میں زندگی کی کٹھن راہوں پر صبر و استقلال کے ساتھ چلنے کا سبق سیکھتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ناظم حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ جس کی مشیت کے بغیر اس دنیا کا کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہو کر زندگی گزارنے کا سلیقہ جان جاتا ہے اور اس دنیاوی زندگی سے بیزاری یا محرومی کا احساس اسے جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔

ایک صاحب ایمان و ادراک شخص جنگ و امن، معیشت و سیاست اور تعلیم و ثقافت کے بارے میں سارے فیصلے ایمان کی روشنی میں کرتا ہے۔ آخرت میں جواب دہی کا تصور اسے دنیا میں انسانوں کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے۔ اگر عقیدۂ آخرت نہ ہو اور جزا و سزا پر ایمان نہ ہو تو محض دنیاوی قوانین انسانوں کو باہم متحد اور ان میں اخوت و ہمدردی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسانیت کی عالمگیر فلاح ہی ایمان پر ہے۔ ایمان ہی کے ذریعہ انسان کو اپنی ہستی اور اس کے مقام کا صحیح ادراک حاصل ہوتا ہے اور اس کے مقصد وجود اور دائرہ کار کا تعین ہوتا ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر اس پر نہ صرف دنیاوی برکات کا دروازہ کھل جاتا ہے ——— بلکہ ایسے ہی بندوں کے لئے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے :-

یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔

اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف کی راضی برضا ہو کر رجوع کر، اور میرے بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا۔

جدوجہد کی برکتیں

"جدوجہد" اردو زبان میں سعی و کوشش کے معنی میں مستعمل ہیں۔ انسانی زندگی سعی و عمل سے عبارت ہے۔ زندگی کا دوسرا نام ہی حرکت ہے اور حرکت عمل کو مقتضی ہے اور عمل مقصد کو چاہتا ہے۔ مجرّد عمل نہ مطلوب اور نہ پسندیدہ، اسکے ساتھ وابستہ مقصد اس میں بھلائی یا برائی کو متعین کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جدوجہد اور سعی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گو ان کے معنی اور مفہوم سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن وہ تمام معانی اپنے عام مفہوم میں انسانی سعی و کوشش سے مربوط ہیں۔

قرآن حکیم نے انسان کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا منصب ہے جو انسان کے شرف اور بزرگی کی سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن یہ شرف اور بزرگی اپنے کچھ مطالبے رکھتی ہے اور انسان کے ذمہ کچھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے، جو ظاہر ہے، کہ جہد و عمل کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے قرآن حکیم انسان کو سعی و کوشش کی تلقین کرتا ہے اور واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے "لیس للانسان الاّ ما سعی" انسان کے لئے وہی ہے جس کی اس نے سعی کی، گویا کوئی شخص سعی و عمل کے بغیر کچھ نہیں پاتا —— یہ ایک قانون قدرت ہے، قاعدہ فطرت ہے، اللہ کی سنت ہے، گو اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنے فضل و کرم سے، دنیاوی نعمتوں سے نواز دے اور آخرت میں اپنے فضل و کرم سے درجات بلند کرے۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، جدوجہد اور سعی و عمل کے ساتھ مقصد کی وابستگی اس کے خیر و شر ہونے کا ایک مدار اور معیار ہوتی ہے۔ اگر مقصد اچھا اور نیک ہے تو وہ سعی و کوشش محمود کہلائے گی اور اگر مقصد غلط اور برا ہے تو وہ جدوجہد اور سعی و کوشش بھی نامحمود اور نامشکور کہلائے گی۔ دوسرے لفظوں میں جدوجہد اور سعی و عمل کا مشروع ہونا لازمی ہے، یعنی وہ سعی و کوشش اور جدوجہد ایسی ہو کہ شرع نے اس کو جائز تسلیم کیا ہو اور مباح قرار دیا ہو۔ ورنہ وہ سعی و عمل اور جدوجہد قرآنی دائرہ سے خارج قرار دی جائے گی، ان کا ثمرہ گو دنیا میں کسی کو اچھا لگے، مگر آخرت کی ترازو میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔

سورہ کہف میں ارشاد ہوتا ہے:-

"الذین ضلّ سعیھم فی الحیاۃ الدنیا، وھم یحسبون انّھم یحسنون صنعاً"

وہ لوگ جن کی سعی و کوشش ان کی دنیاوی زندگی میں اکارت گئی، درآں حالیکہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھا کام کرتے ہیں۔ یعنی ان کی اس دنیاوی زندگی میں ساری دوڑ دھوپ دنیا ہی کے لئے تھی، آخرت کا کبھی خیال نہ آیا، محض دنیا کی ترقیات اور مادی کامیابیوں کو بڑی معراج سمجھتے رہے اور اس بات کی کبھی فکر نہ کی کہ ایک دن خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنی تمام تر زندگی، تمام تر جدوجہد اور تمام تر سعی و کوشش کا جواب دینا ہے کہ وہ اگر دنیا کے لئے تھی تو دنیا ہی میں رہی، آخرت میں کام نہ آئی۔ گویا ساری جدوجہد آخرت کے نقطۂ نگاہ سے اکارت گئی، بے سود و لاحاصل ثابت ہوئی۔

بات یہ ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے سلسلے میں اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے وہ زندگی کو صرف اس دنیا تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس دنیا کو "مزرعۃ الآخرۃ" آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے۔ مقصد عمل اور نتائج عمل کو آخرت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ سورۂ اسراء میں ارشاد ہوتا ہے:-

"ومن اراد الآخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا وھو مومن فاولئک کان سعیھم مشکورا"

یعنی جس کے دل میں ایمان و یقین کی شمع روشن ہے اور نیک نیتی سے خدا کی خوشنودی اور ثواب اُخروی کی خاطر پیغمبر علیہ السلام کے تبلائے ہوئے طریقے کے مطابق عملی دوڑ دھوپ کرنا۔ اس کی سعی و کوشش بارگاہ خداوندی میں حسن قبول سے سرفراز ہوگی اور وہ قرآن پاک کی زبان میں "مفلح" یعنی "بامراد" کامیاب و کامران کہلائے گا۔

اسلام ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے، سعی و عمل کو ترک کرنے اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کی مذمت کرتا ہے، وہ یاد دلاتا ہے "ولا تنس نصیبک من الدنیا" دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔ لیکن وہ اس دنیا اور اس میں کی جانے والی تمام تر جدوجہد کو آخرت کے تابع کرنا چاہتا ہے۔ ہماری سعی و عمل کا جو قدم بھی اٹھے وہ اخروی فلاح سے ہمیں قریب تر کر دے۔

مثال کے طور پر انسان کا اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے معاش حاصل کرنے کا مسئلہ ہے۔ اسلام اس کو عین فریضہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ "فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ" کہ زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق حلال تلاش کرو کا حکم دیتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے "ان کان خرج یسعی علی ولدہ صغارا فھو فی سبیل اللہ وان کان خرج یسعی علی ابوین شیخین کبیرین فھو فی سبیل اللہ وان کان خرج یسعی علی نفسہ یعفّھا فھو فی سبیل اللہ" کہ جو شخص اپنے گھر سے نکلا بایں نیت کہ اپنے چھوٹے بچوں کے لئے سعی کرے۔ پس اس کا وہ عمل سبیل اللہ میں داخل ہے، اور جو نکلا اپنے بوڑھے ماں باپ کی خاطر تو اس کا یہ عمل بھی فی سبیل اللہ ہی شمار ہوگا اور جس نے اپنے نفس کے بارے میں سعی کی کہ اس کو پاکیزہ رکھے تو اس کا یہ عمل بھی فی سبیل اللہ ہی ہے۔

دراصل اسلام جدوجہد اور سعی و عمل کو اور اس کے مقاصد اور نتائج کو شریعت کے

تابع رکھنا چاہتا ہے، وہ تمام تر دنیاوی ترقیوں، بلکہ تسخیر کائنات کی تلقین اور ہدایت کرتا ہے مگر مقصد محض دنیا طلبی نہ ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :-

چیست دنیا از خدا غافل بدن

دنیا کیا ہے، خدا سے غافل ہو جانا، اگر انسان خدا کو یاد کرتے ہوئے، اس کے احکام کے مطابق دنیا میں رہتے ہوئے زندگی میں جدوجہد اور سعی و کوشش کرتا ہے تو اس کی ساری جدوجہد بلکہ ساری زندگی قرآن حکیم کی روشنی میں عبادت ہے۔

اسلام انسانی جدوجہد کا محور صرف اپنی ذات ہی کو قرار دینے کا مخالف ہے کہ جدوجہد سے جو بھی منافع حاصل ہوں وہ صرف اسی کے لئے ہوں اور وہی ان کا مستحق قرار پائے، بلکہ وہ اپنی جدوجہد سے حاصل کی ہوئی منفعتوں کو معاشرے کے دوسرے ضرورت مند افراد تک پہنچانے کی تلقین کرتا ہے۔ اس سے ان کی جدوجہد کامیاب اور اس سے حاصل ہونے والی منفعتوں میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں سے ایک شخص ایک روز کسی میدان سے گزر رہا تھا کہ اس نے آسمان کی جانب سے ایک آواز سنی۔ نظر اوپر اٹھا کر دیکھا تو ایک ابر کے ٹکڑے سے آواز آ رہی تھی کہ فلاں شخص کے باغ پر جا کر برس۔ اس شخص کو بڑا تعجب ہوا وہ ابر کا ٹکڑا جس جانب چلا یہ شخص بھی اسی جانب روانہ ہوا اور کچھ مسافت طے کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک باغ پر ابر کا وہ ٹکڑا ٹھہر کر برسا اور پھر چلا گیا۔ یہ شخص اس باغ میں داخل ہوا تو ایک جوان کو اس باغ میں کام کرتے ہوئے پایا۔ اس شخص نے اس سے کہا کہ کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دے سکتے ہو؟ اس جوان نے اثبات میں جواب دیا۔ اس شخص نے تمام وہ واقعہ جو دیکھا اور سنا تھا۔ بیان کرتے ہوئے دریافت کیا کہ وہ کونسا عمل ہے جس کی بنا پر اللہ کا تم پر یہ فضل ہوا ہے۔ اس جوان نے جواب دیا کہ میری اپنی نظر میں تو کوئی ایسا عمل جو اس فضل کا باعث ہو، نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اتنی بات ہے کہ میں اپنے باغ کی پیداوار کے تین حصے کرتا ہوں۔ ایک حصہ غربا و مساکین کیلئے اور دو حصے اپنے

اہل و عیال کی ضرورت کیلئے رکھتا ہوں۔ اس داخل ہونے والے شخص نے کہا۔ بس یہی وجہ ہے کہ تمہاری جدوجہد اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے جو اس فضل کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا تمہارے گھر میں کوئی مال بھی ہے؟ عرض کیا۔ جی ہے ایک چادر جس کو اوڑھ بھی لیتے ہیں اور کچھ بچھا لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے۔ جس سے پانی پی لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ، وہ دونوں چیزیں لے آیا، حضور انور (صلعم) نے اس سے وہ دونوں چیزیں لے لیں اور فرمایا ان دونوں چیزوں کو کون خرید تا ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ میں ایک درہم میں خرید تا ہوں۔ حضور نے فرمایا اور کوئی خرید تا ہے۔ دوسرے شخص نے عرض کیا۔ میں دو درہم کو لیتا ہوں، حضور نے وہ دونوں چیزیں اس کو دے کر دو درہم لیکر اس سائل کو مرحمت فرماتے ہوئے فرمایا۔ ایک درہم سے خور و نوش کا سامان خریدو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خریدو اور میرے پاس آؤ۔ وہ شخص لے آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ ڈالا اور فرمایا جاؤ لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرو اور پندرہ یوم تک میرے پاس نہ آنا۔ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرنے لگا۔ پھر مدت مذکور کے بعد حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے پاس پندرہ درہم موجود تھے۔ جس کے کچھ حصے سے اس نے خور و نوش کا سامان خریدا اور کچھ سے کپڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ عمل تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن سوال کرنے کی بناء پر تیرا چہرہ داغدار ہو۔

"بندۂ مومن"

قرآن حکیم کی روشنی میں "بندۂ مومن" کے بارے میں گفتگو کے آغاز ہی میں یہ بات
ہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآنِ حکیم کا اصل مخاطب انسان ہے۔ خلقی اور فطری اعتبار سے
ارے انسان ایک ملت ہیں جو نفس امر کے اعتبار سے آپس میں برابر ہیں لیکن اسلام کے
طۂ نظر سے خود قرآنِ حکیم کی روشنی میں پورے عالمِ انسانیت کو دو حصوں میں یا دو انواع
ں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک ملتِ اسلام اور دوسری ملتِ کفر۔ ایک حدیث نبوی میں بھی
ی تقسیم کو "ملتین" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا جنس کے اعتبار سے سارے
سان ایک امت یا ایک ملت ہیں لیکن انواع کے اعتبار سے، ان کے ایمان یا کفر
ہ اختیار کر لینے کے سبب ان کی دو نوعیں یا دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک ملت اسلام
یک ملت کفر۔

اسلام دین فطرت ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے، وہ اسلام کے
ط نگاہ سے، اپنی فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے والدین، اس
عزیز و اقارب، اس کا ماحول، اس کی تعلیم و تربیت اس کو فطرت یعنی اسلام کے
ستے سے ہٹا کر غیر اسلام راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرف آنحضرت صلی اللہ
یہ وسلم کی ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ وابواہ یھوّدانہ او ینصّرانہ او یمجسانہ

کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اپنی فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین
س کو یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی بنا لیتے ہیں یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ

ایک اللہ کی پرستش و بندگی کے بجائے ثنویت یا تثلیث یا مظاہر فطرت کی پرستش پوجا پاٹ کرنے لگتا ہے اور اس طرح وہ اپنے اصل مقصد آفرینش کو ہی بھلا بیٹھتا ہے اس کے برخلاف ایک بندۂ مومن اللہ کی ذات کے سوا کسی الٰہ کی پرستش نہیں کر کسی کو اپنا معبود نہیں سمجھتا، وہ اگر جھکتا ہے تو صرف اللہ کے آگے، وہ اگر حکم مانتا ہے صرف اللہ کا۔ یہ ہے وہ بنیادی نقطہ، مرکزی خیال یا محور اصلی جس کے چاروں طرف ایک بندۂ مومن کی ساری زندگی گردش کرتی ہے۔ جس کا منتہائے نظر اور غایت آخر صرف اور صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہوتی ہے۔ آپ سارا قرآن پاک پڑھ جائیے، آپ کو جا بجا ایسے شواہد ملیں گے اور ایک دوسرے سے متصل ملیں گے جہاں ا کفر، مومن و غیر مومن کے درمیان یہ خط امتیاز واضح طور پر کھینچا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن حکیم یہ تلقین کرتا ہے کہ تم ہرگز صاحب ایمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ا حکم نہ مان لو کہ ہر وہ امر جس میں تم جھگڑتے ہو، اختلاف کرتے ہو، اس کو فیصلے کے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دو اور جب وہ کوئی فیصلہ فرما دیں تو اس تمہارے دلوں میں کوئی تنگی نہ پیدا ہو کیونکہ وہ فیصلہ تمہارے خیال، تمہاری خواہش اور مرضی کے مطابق طے نہیں ہوا، اور تمہارا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ تم اس فیصلے پر اپنا تسلیم خم کر دو اور صدق دل سے اس فیصلے کو مانو اور اس پر عمل کرو۔

" فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدو فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیما " (۴ : ۶۵)

اور ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

" وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکو لھم الخیرۃ من امرھم "

کہ کسی مومن یا مومنہ عورت کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ جب اللہ اور اس کا کسی امر کے بارے میں فیصلہ فرما دیں تو انہیں اس معاملے میں کچھ بھی اختیار باقی رہے

سورہ مومنون میں ایسے ہی مومنوں کو فلاح یاب ہونے کی خوشخبری دی گئی اور
ان کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا :۔

قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون ،
والذین ھم عن اللغو معرضون ،
والذین ھم للزکوٰۃ فٰعلون ،
والذین ھم لفروجھم حٰفظون ، الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت
ایمانھم فانھم غیر ملومین ، فمن ابتغی وراء ذالک فاولٰئک
ھم العٰدون ، والذین ھم لامٰنٰتھم وعھدھم راعون ،
والذین ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون ،
اولٰئک ھم الوارثون ،
الذین یرثون الفردوس ،
ھم فیھا خلدون "

یعنی انتہائی فلاح اور کامیابی ان مومنوں کے لئے ہے جو خضوع و خشوع کے
ساتھ مقررہ اوقات میں نمازیں ادا کرتے ہیں ، فضول و بے کار باتوں اور مشغلوں میں وقت
ضائع نہیں کرتے بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص لغو ، بے ہودہ اور نکمی بات کہے تو ادھر سے
منہ پھیر لیتے ہیں اور بے فائدہ باتوں اور جھگڑوں میں ، جن سے نہ دین کا کوئی فائدہ ہو
نہ دنیا کا ، اپنے آپ کو نہیں پھنساتے ۔ وہ پابندی کے ساتھ اپنے مالوں میں سے
زکوٰۃ کو ، جو اللہ نے ان کے مالوں پر واجب کر دیا ہے ، برابر ادا کرتے رہتے ہیں ، یہ نہیں
کہ کبھی زکواۃ دی اور کبھی نہ دی ، وہ اپنے صنفی تقاضوں کو جائز حدود میں رہتے ہوتے
پورا کرتے ہیں اور حدود سے تجاوز نہیں کرتے ۔ امانت اور قول و قرار پر قائم رہتے ہیں ،
خیانت اور بد عہدی نہیں کرتے ، نہ اللہ کے ساتھ اور نہ بندوں کے ساتھ ۔ انہیں دنیا
کی دلچسپیاں اور مصروفیتیں اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل نہیں کرتیں بلکہ وہ نمازوں
کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ اپنے وقت پر مقررہ آداب و شروط کے ساتھ ادا

ہوں۔ پھر خوشخبری دی گئی کہ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت الفردوس میں داخل کیے جائیں
گے اور ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

ان آیات ربانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن اور صالح لوگ بہترین خلائق ہیں
مومنین صالحین سے جو اپنے ایمان وعمل کے اعتبار سے قرآنی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ا
سے اللہ راضی ہوتا ہے اور وہ اللہ سے۔ وہ اس دنیا میں نیکی اور خیر کا جو بھی کام انجا
دیتے ہیں وہ اللہ کے یہاں بہت زیادہ موجب اجر و ثواب ہوتا ہے۔

اسلام "بندۂ مومن" سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایمانی تقاضوں کی تکمی
کے لئے کفر و اسلام کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو اسلام کے اجتماعی مفاد پر قربان کر
دے، اور وہ ہر حال میں اسلام کا وفادار رہے اور آزمائش کے ہر موقع پر ایمان کے ساتھ ثا
قدمی کا مظاہرہ کرے اور کفر و اسلام کے تنازعے میں کسی حال میں کفر کا ساتھ نہ دے ا
اس کا دل بالخصوص اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ نفرت، بغض اور عناد سے خالی اور پاک
صاف ہو۔ ہاں! ضرورت پڑنے پر دوسرے مسلمان بھائیوں کی غلطیوں پر متنبہ کرنا ا
کا ایمانی تقاضا ہے مگر وہ اس طرح ہو کہ اس کے اس انتباہ سے نفرت و بے زاری کے
بیج نہ بوئے جائیں، بلکہ اس کا انداز ناصحانہ، مشفقانہ اور مخلصانہ ہو۔ اس کا ہر انداز ا
ہر عمل اللہ کی صفت رحمت و شفقت اور باہمی امداد و تعاون کا مظہر ہو اور مظہر بھی
اسی خیال کو حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے اپنے ان اشعار میں سمونے کی کوشش کی

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا و کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات۔
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز

ترتیب قرآن

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے اور اس وقت تک قرآن مجید کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا" الخطابی کا قول ہے کہ جب سرورِ عالم کی وفات کے باعث نزول قرآن کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس سچے وعدہ کو پورا کرنے کیلئے جو اس کی حفاظت کے متعلق فرمایا تھا، خلفائے راشدین کے دل میں قرآن کو جمع کرنے کی خواہش پیدا فرمائی۔ پھر اس عظیم الشان کام کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے مطابق ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سے ہوا۔

کتابت قرآن کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہد مبارک میں شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "کہ میری باتوں میں سے قرآن کے سوا اور کسی چیز کو نہ لکھو" اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھ لیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ سب ایک جگہ جمع نہ تھا۔

قرآن مجید کو جمع اور مرتب کرنے کا اہم کام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور ان کے روبرو ہوا۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جنگ یمامہ میں بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شہید ہونے کی خبر ملی تو اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے میرے پاس آکر کہا کہ معرکۂ یمامہ میں قرآن کریم کے بہت سے حفّاظ و قاری شہید ہوئے اور مجھے ڈر ہے کہ آئندہ معرکوں میں بھی وہ شہید ہوتے جائیں گے

اور اس طرح مبادا بہت سا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ تم قرآن کے جمع کرنے کا حکم دو۔ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیا کہ جس کام کو رسول اللہؐ نے نہیں کیا میں اسے کس طرح کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خدا کی قسم یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں بہتر ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بار بار مجھ سے کہتے رہتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا اور میں نے اس بارے میں وہی رائے قائم کر لی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کی تھی۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ "تم ایک سمجھ دار نوجوان ہو اور ہم تم کو متہم نہیں کرتے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی تھے۔ اسلئے اب قرآن کی تفتیش اور تحقیق کر کے اسے جمع کرو۔" زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں " واللہ مجھے ایک پہاڑ اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینے کا حکم دیتے تو یہ بات مجھ پر اتنی گراں نہ ہوتی جس قدر قرآن جمع کرنے کا حکم مجھ پر شاق گزرا اور میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تم دونوں وہ کام کس طرح کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا " واللہ یہ بات بہتر ہے " اور پھر وہ برابر مجھ سے اس بارے میں بار بار کہتے رہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے میرا دل بھی اسی بات کے لئے کھول دیا جس بات کے واسطے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دل کھولا تھا۔ پھر تو میں نے قرآن کی تلاش اور جستجو شروع کی اور اسے کھجور کی شاخوں اور سفید پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کر دیا۔" زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قرآن کو محض لکھا ہوا پانے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی شہادت ان لوگوں سے بھی بہم پہنچا لیتے جنہوں نے اسے سن کر یاد کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی حافظ قرآن تھے۔ غرضیکہ قرآن مکتوب کے وجود پانے اور خود حافظ قرآن ہونے کے باوجود حفظ و کتابت کی شہادتوں کو بھی بہم پہنچا کر اسے جمع فرماتے تھے تاکہ قرآن اسی اصل سے لکھا جائے جو رسول اللہ کے روبرو لکھا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہو

ہو چکا تھا، چنانچہ وہ نقل شدہ صحیفے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، ان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی محافظت کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو جانے کے بعد وہ صحائف بجنسہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ رہے۔

امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آرمینیہ اور آذربائیجان کی فتح کے موقعہ پر شامی اور عراقی دونوں ساتھ مل کر معرکہ آرائی میں شریک تھے۔ وہاں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ان دونوں ممالک کے مسلمانوں کا قرأت قرآن میں اختلاف دیکھ کر سخت پریشان تھے اس وقت آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ یہود و نصاریٰ کی طرح امت مسلمہ کے باہم مختلف ہونے سے پہلے ہی اس کی خبر لیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس کہلا بھیجا کہ جو صحیفے آپ کے پاس امانتاً رکھے ہیں، انہیں بھیج دیجئے تاکہ میں ان کو مصحفوں میں نقل کرانے کے بعد پھر آپ کے پاس واپس بھیج دوں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ صحائف آپ کو بھجوا دیئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرات زید بن ثابت، عبداللہ ابن زبیر سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ان کے نقل کرنے پر مامور کیا اور آخر الذکر تینوں قریشی بزرگوں سے کہا کہ جہاں کہیں قرآن کے تلفظ میں تمہارے اور زید بن ثابت کے درمیان اختلاف ہو وہاں اس لفظ کو خاص قریش کی ہی زبان میں لکھنا کیونکہ قرآن ان ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ قریشیوں کی اس جماعت نے مل کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کی اور جب وہ ان صحیفوں کو نقل کر چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ صحائف بدستور حضرت حفصہؓ کے پاس واپس بھیج دیئے اور اپنے لکھوائے ہوئے مصحفوں میں سے ایک ایک مصحف ممالک اسلامیہ کے ہر گوشے میں ارسال کر دیا۔ اور حکم دیا کہ اس مصحف کے سوا اور جس قدر صحیفے یا مصحف پہلے موجود ہوں ان کو سوخت کر دیا جائے۔

قاضی ابوبکر نے کتاب الانتصار میں لکھا ہے کہ آیتوں کی ترتیب ایک واجبی امر اور لازمی حکم ہے کیونکہ جبرائیل ہی آنحضرت سے اس بات کو کہہ دیا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں جگہ پر رکھو۔ چنانچہ وہ تمام قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اس کے لکھے جانے کا حکم دیا، اس کو منسوخ نہیں کیا اور نہ اس کے نزول کے بعد اس کی تلاوت کو منسوخ کیا، وہ یہی قرآن ہے جو مابین الدفتین پایا جاتا ہے جس کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جمع کروایا۔ اور جس کو مصحف عثمان رضی اللہ عنہ حاوی ہے۔ اس قرآن میں نہ کوئی کمی ہے اور نہ کسی طرح کی زیادتی۔ اس کا نظام و ترتیب اسی طرح ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی ترتیب فرمائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سورتوں کی آیتوں کے یکے بعد دیگرے رکھ کر ترتیب دیا نہ اس میں سے کسی پچھلی آیت کو آگے کیا اور نہ آگے کی آیت کو پیچھے کیا۔ پھر امت نے ہر ایک سورۃ کی آیتوں کی ترتیب ان کی جگہوں اور موقعوں کو اسی طریقہ پر یاد کیا اور برقرار رکھا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص قراتوں اور نفس تلاوت کو سیکھا تھا۔

ابن وہب سے مروی ہے کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قرآن کی ترتیب اسی انداز پر کی گئی ہے۔ جس انداز پر صحابہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے تھے۔ امام بغویؒ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "شرح السنہ" میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کے قرآن کو جمع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کے حافظوں کی موت سے اس کے کسی حصے کے ضائع جانے سے ڈرتے تھے، اس واسطے انہوں نے جس طرح پر قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اسی انداز پر بلا کسی تقدیم و تاخیر کے اس کو لکھ لیا۔ یہاں تک کہ اس کی ترتیب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کی ہوئی ترتیب کے علاوہ اپنی رائے کو ہرگز دخل نہ دیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو قرآن کریم کے نازل شدہ حصوں کی تلقین اسی ترتیب پر فرمائی تھی جو آج ہمارے مصحفوں میں پائی جاتی ہے اور آپ کو اس ترتیب پر جبرائیل نے واقف کیا تھا جو ہر آیت کے نزول کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو بتا دیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت کی فلاں آیت کے بعد لکھی جائے گی۔

امام مالک کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کے منتشر اوراق و اجزاء کو صرف جمع کرنے کی کوشش کی تھی نہ کہ اسے ترتیب دینے کی اس واسطے کہ بلاشبہ قرآن اسی ترتیب کے ساتھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان دنیا پر نازل فرمایا پھر بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تلاوت قرآن کی ترتیب نزول کی ترتیب کے علاوہ ہے۔

ابن الحصّار کا قول ہے کہ سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کا ان کی جگہوں میں رکھنا محض وحی کے ذریعے عمل میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ہی فرما دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھو۔ چنانچہ آیتوں کی ترتیب اپنی اپنی سورتوں میں رسول اللہ کی توقیف یعنی ہدایت اور امر کے مطابق ہوئی ہے اور اس ترتیب کا یقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت کی نسبت متواتر نقل سے حاصل ہوا ہے۔ اور اس بات سے بھی کہ صحابہ کا اسے مصحف میں اسی طرح رکھنے پر اجماع ہے لہٰذا جو شخص کسی آیت یا سورت کو مقدم یا مؤخر کرے گا وہ گویا نظم قرآن میں خلل ڈالے گا۔

تقویٰ

تقویٰ کے لفظی معنی "ڈرنے" کے ہیں اور اس کے مجازی معنی پرہیزگاری کے لیے جاتے ہیں۔ شریعت میں تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں یا باتوں سے پرہیز کرنے، اجتناب کرنے اور بچنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے بچا جائے اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان کو بلا چون وچرا کیا جائے اور ان ہدایات پر عمل کیا جائے۔

تقویٰ کی بنیاد ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت پر ہے۔ چنانچہ تقویٰ بغیر ایمان کے حاصل نہیں ہوتا۔

تقویٰ اسلامی اخلاقیات کی بنیاد اور انسانی فضیلت کا قرآنی معیار ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ "اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ مکرم وہ ہے جو متقی ہو۔"

تقویٰ کی اصل مومن کے قلب کا فعل ہے۔ یعنی حقیقی تقویٰ قلب کا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ الا ان التقویٰ ھٰھنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ یاد رکھو! تقویٰ یہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان کے دل میں اللہ جل شانہٗ کی محبت اور اطاعت کا جذبہ مستقلاً جاگزیں ہوگا تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اس کے احکام کی اطاعت نہ کرے! چنانچہ جب ہمارے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی صحیح محبت اور حقیقی احترام ہوگا تو ہمارے ظاہری افعال اور اعمال

بھی اسی محبت اور احترام کے مطابق ہو جائیں گے اور ایک مسلمان جس کے ظاہر و باطن دونوں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں مقید ہوں۔ وہ یقیناً صاحبِ تقویٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں تقویٰ اختیار کرنے پر بے حد زور دیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کی ۴۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ

انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ عدل کرو۔ یہی بات پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ایسا عدل و انصاف کرو جس کے کرنے میں کسی کی دوستی یا دشمنی کا خیال نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسے عدل کا سبب خدا کا خوف ہی ہو سکتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ تلقین بھی کی جا رہی ہے "واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون" اللہ سے ڈرو، اللہ کو خوب خبر ہے، جو تم کرتے ہو۔

سورۃ اعراف کی ۲۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔" لباس التقویٰ ذالک خیر" پرہیزگاری کا لباس سب سے بہتر ہے۔ یہ بہترین خیر و برکت، نیکی و سعادت ہے۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، " والعاقبۃ للتقویٰ" عاقبت تقویٰ ہی کے لئے ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ کی ۱۹۷ ویں آیت کے ذریعے" تزودوا فان خیر الزاد التقویٰ" کہہ کر آخرت کے لئے زادِ راہ جمع کرنے کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے اور بتلایا جا رہا ہے کہ یہ جمع کیا ہوا مال و دولت، کوٹھی، کاریں اور بڑی بڑی ملیں اور کارخانے تمہارے لیے آخرت کی زادِ راہ نہیں ہیں۔ آخرت کی بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اسی کو اختیار کرو۔ آخرت میں یہی تمہارے کام آنے والا ہے۔

ارکانِ اسلام میں حج کی بڑی فضیلت ہے۔ حج کے بعض مقامات اور ارکان و افعال کو قرآنِ کریم شعائر سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ حج میں ارشاد ہوتا ہے:۔

" ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب" کہ جو کوئی اللہ کی نشانیوں

کی تعظیم کرے گا، پس تحقیق وہ تعظیم قلب کی پرہیزگاری کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی ضمن میں ارشاد ہوتا ہے "لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم" جو تم جانوروں کی قربانی کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کو نہ تو اس کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اس کا خون بلکہ اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ یہی اصل الاصول تمام بدنی اور مالی عبادات کا ہے۔ ہماری عبادات، صدقات، خیرات سب میں تقویٰ درکار ہے۔ اگر ان میں سے کسی میں بھی ریاکاری، نام ونمود یا غیر اللہ کی آمیزش ہوگی تو وہ عبادت خواہ بدنی ہو یا مالی، اللہ کی نظر میں نامقبول ہوگی۔

قرآن پاک تقویٰ حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ خود قرآن پاک اس کی شہادت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "وانہ لتذکرۃ للمتقین" درحقیقت یہ قرآن پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غلط روی، غلط کاری اور اس کے برے نتائج سے بچنا چاہتے ہیں ان لوگوں کے لئے یہ قرآن نصیحت ہے۔

سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں کتاب قرآن کو "ھدی للمتقین" فرمایا گیا ہے۔ کہ یہ قرآن ایسے بندوں کے واسطے راہنمائی کا سبب ہے۔ جن میں تقویٰ اختیار کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو تقویٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہوں، جو تقویٰ اختیار کرنا چاہتے ہوں یا صفت تقویٰ سے قریب ہونا چاہتے ہوں یا اگر وہ پہلے سے متقی ہوں تو تقویٰ میں زیادتی اور مداومت کے طلبگار ہوں۔

تقویٰ کا ایک درجہ یہ ہے کہ شرک سے بچے اور فرائض ادا کرے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے "متقین۔ یہی مومنین ہیں جو شرک سے بچتے ہیں اور طاعت الہٰی پر عمل کرتے ہیں۔" حضرت ابن عباسؓ ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ متقین یہی مومنین ہیں جو امور ہدایت کے ترک کرنے میں اللہ سے ڈرتے ہیں۔ حسن بصریؒ کا قول ہے کہ متقین وہ ہیں جو حرام سے بچتے ہیں اور فرائض ادا کرتے ہیں۔ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مومن ایسا فعل جو

اگرچہ مباح ہو مگر اس کے موافق شرع ہونے یا نہ ہونے میں تردّد ہو تو اس کو بھی احتیاطاً چھوڑ دے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت کعب نے جواب دیا کہ ایک پگڈنڈی ہے جسکے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہیں۔ اس پگڈنڈی پر دامن کو کانٹوں سے بچاتے ہوئے چلنا ـــــ یہی تقویٰ ہے۔

تقویٰ اختیار کرنے کے طریقے سے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے اپنے مواعظ میں لکھا ہے کہ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے بنیادی چیز قلب کو درست کرنا ہے اور اسے درست حالت میں رکھنا ہے۔ جسطرح انسانی جسم کو مادی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہمارا قلب بھی تقویٰ و پرہیز گاری کے حصول کیلئے روحانی غذا کا محتاج ہے۔ تقویٰ کی صفت پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ دنیا کی بے جا طلب اور محبت کو ترک کیا جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ مر کر خدا کے سامنے جانا ہے اور اپنے تمام افعال و اعمال کے لیے جوابدہ ہونا ہے۔ اس کیلئے نیک عمل کی ضرورت ہے۔ اگرچہ چیز و نیکی کا عمل شروع کرنے میں پہلے پہل تکلف ہوگا لیکن پھر عادت ہو جائیگی اور اسکی برکت سے اللہ کی محبت بڑھے گی۔ اور اسکا راز یہ ہے کہ انجام کار سہولت ہوگی۔ ظاہر سے باطن میں مدد ملے گی۔ اس کیلئے اہل اللہ کی صحبت، اللہ کا ذکر اور نفس کا محاسبہ ضروری چیزیں ہیں۔ یہ سب اللہ کی محبت کے حصول کے ذرائع ہیں۔ جن سے انشاء اللہ تعالیٰ حقیقتِ طاعت میسر ہوگی اور ایک مسلمان ظاہراً و باطناً متقی بن جائیگا۔

حضرت ابوالدرداء اپنے اشعار میں فرماتے ہیں:۔

- انسان اپنی تمناؤں کا پورا ہونا چاہتا ہے۔
- اور خدا کی مشیت پر نظر نہیں رکھتا۔
- حالانکہ ہوتا وہی ہے جو خدا کی مشیت ہو۔
- وہ اپنے دنیاوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔
- حالانکہ بہترین فائدہ اور عمدہ مال "تقویٰ" ہے یعنی خدا سے ڈرنا۔

حسد

کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت یا خوبی یا فضیلت عطا فرمائی ہے اس پر کسی دوسرے شخص کا جل کر یہ چاہنا کہ وہ نعمت، خوبی یا فضیلت اس شخص سے چھین کر خود اس کو حاصل ہو جائے یا کم از کم اس دوسرے شخص کے پاس سے ضرور چھن جائے "حسد" کہلاتا ہے۔

حسد ایک بہت بڑی برائی ہے۔ یہ حقیقت میں ایک روحانی بیماری ہے۔ جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے۔ حسد، غرور، تکبر، باہمی عداوت اور خباثت نفس سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری بہت سی اخلاقی برائیوں کے پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

جو شخص حسد کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ وہ نعوذ باللہ یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے خود اسے اس نعمت سے محروم رکھ کر اس کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے، کیونکہ وہ دوسرا شخص، اس کے خیال کے مطابق خود اس کے مقابلے میں اس نعمت کا اہل نہ تھا۔ اس خیال سے ایک اور برائی نفس میں کبر و غرور کی پیدا ہوئی کہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور افضل جانا، گویا وہ شخص جو اس نعمت، خوبی یا فضیلت سے بہرہ ور ہے، نااہل ہے اور اس شخص کے مقابلے میں حاسد خود زیادہ اہل، لائق اور ہنرمند ہے۔ نعوذ باللہ خدا ظالم ہے کہ اس نے مستحق کے مقابلے میں ایک غیر مستحق کو اپنے انعام و اکرام سے نوازا؟

دوسرے لفظوں میں وہ اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم سے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے جو اس قادر مطلق نے اپنے دوسرے بندوں پر فرمائی۔ ظاہر ہے کہ ایک عبد، بندے اور

غلام کا یہ منصب نہیں کہ وہ اپنے آقا کی تقسیم پر اعتراض کا خیال بھی دل میں لائے!

حسد سے پیدا ہونے والی برائیوں اور اس کے مہلک نتائج پر اگر ہم ذرا گہری نظر ڈالیں تو غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حاسد انسان خدا سے بغاوت کرنے کے جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے اور ایک باغی کی جو سزا ہوتی ہے وہ ہم سب جانتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلی سزا تو حاسد کو یہ ملتی ہے کہ وہ اپنے مالک کی نظر کرم سے محروم ہو جاتا ہے، دنیا میں رسوائی و ناکامی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور عاقبت میں سزائے جہنم ہے۔

ایک حاسد شخص اپنے محسود کو جس سے وہ حسد کرتا ہے، نقصان پہنچا سکے یا نہ پہنچا سکے لیکن خود اپنے کو ضرور نقصان پہنچاتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس کے اپنے نفس میں ایک آگ سی لگی رہتی ہے۔ جو ہمہ وقت اس کے جسم و جان کو حسد کی آگ میں جلاتے رکھتی ہے، اس کی جو تمنائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں، وہ پوری نہیں ہو پاتیں اور اندر ہی اندر محرومی کا غم اسے کھائے جاتا ہے اور وہ ہمہ وقت ایک سرگردانی کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ قناعت و آرام کی زندگی کو رخصت کر کے ہر وقت جلن اور دنیاوی کوفت میں مبتلا رہتا ہے۔

کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جب اس کی ساری کوششیں بلکہ سازشیں محسود کو نقصان پہنچانے کی بے کار جاتی ہیں تو وہ اس پر جادو، ٹونے ٹوٹکے اور منتر کرانے پر اتر آتا ہے۔ جس کا ارتکاب بالآخر کفر کا سبب بن جاتا ہے اور اس کی تمام نیکیاں، آخرت کے نقطۂ نظر سے رائیگاں، بے کار اور ضائع ہو جاتی ہیں۔

حسد کا یہ فساد خود حاسد کی اپنی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ حاسد اپنے آپ کو اس دوسرے شخص کے مقابلے میں اس نعمت کا زیادہ مستحق سمجھ کر اپنے بے جا اقوال اور افعال کے ذریعہ معاشرے میں انتشار پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی زبان شکوہ و شکایت کی زبان بن جاتی ہے اور دوسروں کے ذہن بھی اس کی ان باتوں سے بے جا طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

حسد کا اجتماعی نقصان یہ ہوتا ہے کہ حاسد کی ظاہری اور باطنی قوتیں اور صلاحیتیں

صحیح عمل سے معطل ہو کر غلط عمل میں لگ جاتی ہیں جس کا بالآخر یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے باہمی کریمانہ اخلاق مٹتا جاتا ہے، باہمی اخوت رواداری، ہمدردی اور چشم پوشی ختم ہونے لگتی ہے اور معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے باہمی کینہ، بغض اور حسد رکھنے کے سبب بچھوؤں کی خاصیت اختیار کر لیتے ہیں کہ موقع ملے تو ڈنک ماریں اور نقصان پہنچائیں۔ ایسا معاشرہ فلاح سے بے بہرہ اور امن و سکون اور محبت و سلامتی سے ناآشنا ہو کر انسانی معاشرہ کہلانے کا بھی مستحق نہیں رہتا۔

حسد کے شر اور فساد کی اثر انگیزی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود قرآن حکیم میں جس طرح شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح حاسد کے شر سے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ سورۃ الفلق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی جا رہی ہے کہ اے رسول! آپ کہیئے کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔ "قل اعوذ برب الفلق، من شر ما خلق و من شر غاسق اذا وقب، و من شر النفّٰثٰت فی العقد و من شر حاسد اذا حسد۔"

سنن ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم حسد کے مرض سے بہت بچو، حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلا دیتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں بھی نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح رازدارانہ طریقے سے کسی کے عیب معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیا کرو، اور نہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی بے جا ہوس کرو، نہ آپس میں حسد کرو اور نہ بغض و کینہ رکھو۔"

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-
"تم سے پہلی امتوں کی ایک بیماری تم لوگوں میں منتقل ہو گئی۔ وہ بیماری حسد اور بغض

ہے۔ یہ بیماری دین کو تباہ کردیتی ہے۔" یعنی حسد کے سبب حاسد سے ایسے اقوال اورافعال سرزد ہوتے ہیں جواس کے دین کو تباہ کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے حاسد کے شر سے بچنے کے چند طریقے تعلیم کئے ہیں:۔

(۱) سب سے پہلا اور مؤثر طریقہ حاسد کے شر سے بچنے کا یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے۔

(۲) دوسرا یہ کہ محسود اللہ پر پورا بھروسہ کرے اور یہ یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔

(۳) تیسرا یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے۔ بے صبر ہو کر خود اس سے ایسا کوئی قول یا فعل سرزد نہ ہو کہ خود اس میں اور حاسد میں کوئی فرق نہ رہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو وہ اللہ کی تائید اور مدد سے محروم ہو جائے گا۔

(۴) چوتھا طریقہ یہ ہے کہ حاسد، خدا سے بے خوف اور زمانے سے بے پروا ہو کر کیسا ہی رویہ اختیار کرے، محسود بہر حال تقویٰ پر قائم رہے۔

(۵) پانچواں یہ کہ اپنے دل کو حاسد کی طرف سے بالکل فارغ کرلے اور حاسد کا خیال دل سے نکال دے۔ جیسے کہ اس کے کسی حاسد کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔

(۶) چھٹا طریقہ یہ ہے کہ حاسد کے ساتھ اگر کوئی ضرورت نیکی اور احسان کرنے کی آئے تو اس کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے سے باز نہ رہے۔

انشاء اللہ ان طریقوں پر عمل کرنے سے حاسد کے شر سے محفوظ رہے گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے خود حاسد کے لئے بھی حسد کے مرض سے نجات پانے کے چند طریقے بیان کئے ہیں:۔

(۱) پہلا یہ کہ محسود کی عیب جوئی کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رکھی جائے اور ان کا اظہار بھی کیا جائے۔ اس سے محسود سے حسد میں کمی واقع ہوگی، انشاء اللہ عداوت جاتی رہے گی اور حاسد کو رنج وغم سے نجات ملے گی۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حاسد کو چاہیئے کہ اپنی زبان اور فعل اختیاری کو قابو میں رکھے اور یہ سمجھتا رہے کہ دوسروں کو اللہ تعالےٰ نے جو نعمت عطا کی ہے اس پر جلنا حرام ہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ ہر وقت یہ امر پیش نظر رکھے کہ دنیا کی ہر نعمت فانی ہے، اور محسود کا اقتدار بھی ناپائیدار اور ختم ہونے والا ہے۔ اس لئے کسی دوسرے کی دنیاوی نعمت پر حسد بے کار ہے۔

حُسنِ تدبیر

"حسنِ تدبیر" کے معنی ہیں "اچھی تدبیر" اور تدبیر میں غور و فکر اور سعی و عمل دونوں شامل ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان منجانب اللہ اس بات کا مکلف ہے کہ وہ جملہ امور میں، خواہ وہ امورِ دنیاوی ہوں یا دینی، اللہ کی دی ہوئی عقل کو کام میں لا کر حسنِ تدبیر اختیار کرے اور مکمل غور و فکر اور ہر ممکن سعی و عمل کرے، اور پھر ان امور کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔ دوسرے لفظوں میں ایک انسان کے لئے کوشش و عمل اور حسنِ تدبیر کو اسباب کے درجہ میں اختیار کرنا فرض ہے لیکن ان اسباب کو فی نفسہ مؤثر نہ جانے، اصل مدبر، مؤثر اور مسبب اللہ ہی کو جانے اور سمجھے۔

لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی تدبیر و عمل ہے جو اسلام کی نظر میں مطلوب و محمود ہے؟ نیز یہ کہ اس تدبیر و عمل کی غایت کیا ہونی چاہیئے اور اس کی حدود کیا ہیں اور اس تدبیر و عمل کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں انسان کی جبلی ضرورتوں کی طرف دیکھنا ہوگا۔ بنیادی طور پر ہر انسان اپنے خورد و نوش کے انتظام، موسمی اثرات سے محافظت اور دوسری تمدنی حاجتوں کی تکمیل کے لئے حسنِ تدبیر اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین خصوصیتوں سے نوازا ہے۔ پہلی انسانی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حصولِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے قصد و ارادہ کرتا ہے جو اس کے ذہن و دماغ میں پہلے ایک خیال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور پھر ذہنی قوت سے ارادہ اور عزم کی صورت اختیار کرتا ہے اور دوسری خصوصیت انسان میں حاجت براری کے ساتھ تسکینِ قلب کی خواہش کا

پایا جاتا ہے اور تیسری خصوصیت اس حاجت براری اور تسکین قلب کے حصول کے لئے حسن تدبیر سے کام لینا ہے، جس کا دوسرا نام عمل ہے۔

چونکہ عقل، قوت اور عمل کے اعتبار سے تمام انسان برابر نہیں ہوتے، اس لحاظ سے حسن تدبیر کے بارے میں غور و فکر اور ان کے عمل پیرا ہونے میں بھی انسان آپس میں مختلف ہوتے ہیں، اگرچہ تدبیر کے ابتدائی اور ادنیٰ درجہ میں یکساں طور پر شریک رہتے ہیں، لیکن جو لوگ حسن تدبیر کے اعلیٰ درجہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے واضح نصب العین اور اس کے ساتھ نصب العین کی صداقت و حقانیت پر یقین کامل، عمل پیہم از بس ضروری ہے۔ اگر انسان کے سامنے اس کا نصب العین واضح نہیں ہے تو پھر وہ تدبیر و عمل کے ثمرات سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا حسن تدبیر اختیار کرنے سے پہلے لازمی ہے کہ ہم اپنی تدبیر کا اصلی مقصد متعین کر لیں۔

قرآن پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ سعی و عمل کے سلسلے میں ایک اصولی قاعدہ یہ بیان فرماتا ہے کہ "لَیْسَ لِلْاِنسانِ اِلَّا مَا سَعٰی" کہ انسان کے لئے نہیں ہے، مگر وہ جو اس نے کوشش کی جس کی اس نے سعی کی۔ گویا بنیادی چیز انسان کی سعی ہے، کوشش ہے۔ اللہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کا وجود زمین پر بوجھ کے مترادف ہے، اسی لیے بھیک مانگنا سب سے زیادہ ذلیل کام ہے۔ کیونکہ انسان اپنی سعی و عمل کی قوت کو ترک کر کے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے، اسلام اس کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ تدبیر و عمل کے ثمرات و نتائج سے مطلع فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :-

"مَنْ عَمِلَ صالِحاً فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا"

جس شخص نے نیک عمل کیا وہ اس کے اپنے فائدے کے لئے ہے، اور جس نے کوئی بُرا عمل کیا اس کی پاداش اسی کے ذمہ ہے۔ اس آیت کی روشنی میں تدبیر و عمل کا صالح ہونا بھی ضروری ہے۔ گویا مقصد بھی جائز اور صحیح ہو اور اس کے حصول کے لئے جو

تدابیر اور ذرائع اختیار کیے جائیں، وہ بھی جائز اور درست ہوں ۔ حدیث میں آیا ہے :۔

" إنّ الرجل لیعمل بعمل اهل الجنة وهو من اهل النار "

انسان بعض اوقات ایسے کام کرتا رہتا ہے جو بہشت والے کرتے ہیں، مگر دوزخ والا ہوتا ہے، گویا آخر میں وہ ایسی ناجائز تدبیریں اختیار کرتا ہے اور ایسا بُرا کام کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوزخی ہو جاتا ہے ۔ اس سے ایک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحہ تک نیک تدبیر وعمل میں مشغول رہنا چاہیئے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں ان میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حسن عمل اختیار کرو، پیہم، مسلسل اور مداومت کے ساتھ، خواہ وہ تھوڑا ہی ہو چنانچہ سنن ابن ماجہ میں ——— حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک حدیث منقول ہے :۔

" وكان احب الاعمال اليه العمل الصالح والذى يدوم عليه العبد وان كان يسيرا "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعمال میں سب سے زیادہ محبوب عمل یہ تھا کہ بندہ عمل صالح پر دوام اختیار کرے ۔ اگرچہ وہ عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو ۔ سنن دارقطنی میں بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی مضمون کی ایک حدیث مروی ہے ۔ آپ نے فرمایا:۔

" احب الاعمال الى الله ادومها وان قلّ "

اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل وہ ہے جو زیادہ پابندی سے کیا جائے، خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو ۔

حُسنِ عمل کے تسلسل اور ہمیشہ کرنے سے طبیعت میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس نیک عمل کے موافق آہستہ آہستہ مزاج بن جاتا ہے ۔ اگر عمل پیہم، مسلسل اور مداومت کے ساتھ نہ ہو تو انسانی کردار کی پختگی پیدا نہیں ہوتی ۔ اس کی مثال ایک ایسی بارش کی ہے کہ زمین کے کسی حصہ پر بارش کے چند چھینٹے پڑ جائیں تو اس سے زمین میں کوئی روئیدگی نہیں ہوگی ۔ لیکن اگر بارش کچھ دن یا وقفے وقفے سے ہوتی رہے تو اس زمین میں روئیدگی کے آثار پیدا ہو جائیں گے ۔ مثال مشہور ہے کہ اگر پتھر پر بھی ایک توازن

اور تسلسل کے ساتھ قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا رہے تو بالآخر وہ اپنا ایک نشان بنالیتا ہے، بالکل یہی حالت حسن تدبیر کے ساتھ عمل پیہم کی ہے، خواہ عمل دنیا کے لیے ہو خواہ آخرت کے لیے، لیکن تسلسل اور مداومت کے سبب اپنے نتائج ضرور پیدا کرتا ہے۔ البتہ عمل آخرت کے لیے اخلاص نیت کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ آخرت کے کاموں میں حسنِ تدبیر و عمل کے سلسلے میں بہترین ہدایت، حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:۔

"اعمل لدنیاک کانک تعیش ابداً واعمل لآخرتک کانک یموت غداً"

یعنی دنیا کے کاموں کو ایسا سمجھ کر کرنا چاہیئے کہ گویا تم ہمیشہ دنیا میں رہنے والے ہو جلدی کیا ہے؟ کرلیں گے، لیکن آخرت کے کام کو ایسا سمجھ کر کرنا چاہیئے کہ گویا تم کل ہی مر جاؤ گے۔ دوسرے لفظوں میں آخرت کے عمل کو تعویق و تاخیر میں ڈالے بغیر حسنِ تدبیر کے ساتھ مسلسل انجام دیتے رہنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

حُسنِ سلوک

انسان کی بہت سی اخلاقی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی "حسن سلوک" یعنی دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ ہے۔ حسنِ سلوک کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محض ظاہری طور پر اچھی طرح سے گفتگو یا ملنے جلنے میں بعض آداب و رسوم کا لحاظ کرلیا، بلکہ حسن سلوک شرافت کے کمال اور خیر خواہی کا وہ اعلیٰ جذبہ ہے جو خود کو بھوکا رکھ کر دوسرے کا پیٹ بھرنے اور اپنی ضرورت کاٹ کر دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے انسانی نفس کو تیار و آمادہ کرتا ہے۔ وہ دوسروں پر آئی مصیبتوں کے دفعیہ کے لئے اسی طرح جدوجہد کرتا ہے جس طرح خود اپنی ذات پر آئی ہوئی مصیبت کو دور کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ وہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے استعمال کو صرف اپنی ہی حد تک محدود اور محصور نہیں رکھتا بلکہ اللہ کے دوسرے مستحق بندوں کو بھی ان نعمتوں میں شریک کرتا ہے اور ان نعمتوں کا دائرہ صرف مادی طور پر ہی نہیں روحانی اور اخلاقی دائرہ میں بھی دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ مثلاً اچھے مشورے دینا، دین کی تعلیم اور اخلاقی حالت کی بہتری پر توجہ۔ وہ نہ صرف اپنی زندگی کو برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی برائی کے نتائج سے باخبر اور ان سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے، دوسروں کو بدی کی طرف راغب دیکھ کر اس کی طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ اور ان کو اس بدی سے بچانے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرتا ہے۔ یہ سب حسنِ سلوک ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" کہ تم جبتک ان چیزوں میں سے جو تمہیں محبوب اور پسندیدہ ہیں اللہ کی راہ میں صرف نہ کروگے، کمال نیکی کا درجہ حاصل

یہ کرسکو گے ۔ پھر تعلیم دی گئی کہ اپنے اعزاء و اقرباء اور غرباء و مساکین کی مدد کرو اور یہ سب احسان جتانے کے لیئے نہیں بلکہ "حباً للّٰہ" اللہ کی محبت کی خاطر کرو ۔ گویا حسنِ سلوک اللہ کو راضی کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے ، اور ہمارے کسی عمل سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو اس سے بڑی اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے ؟

اسلامی سیر و تاریخ حسن سلوک کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں ۔ ایک جنگ میں تین صحابۂ کرام زخموں سے چور پیاس کی شدت سے بے چین اور جان بلب تھے ۔ ان میں سے پہلے شخص کو پانی دیا گیا تو اس نے کہا اس دوسرے زخمی کے پاس لے جاؤ اور دوسرے نے کہا اس تیسرے زخمی کے پاس لے جاؤ ، وہ زیادہ سختی میں مبتلا ہے ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک دفعہ کئی فاقوں کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے کہ ایک سائل نے دروازہ پر دستک دی آپ نے سارا کھانا اٹھا کر اس سائل کو دیدیا ، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کتنی بار ایسا واقعہ پیش آیا ۔

لیکن حسن سلوک دکھاوے ، نام و نمود اور شہرت طلبی کے لیئے نہ ہو بلکہ خالص اللہ کی رضا کے حصول کے لیئے ہو ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نیت میں خلوص ہو ، بلا غرض ہو اور دیانت داری کے ساتھ ہو ۔

اپنے دشمنوں کو معاف کر دینا اور ان سے بدلہ لینے کی قوت ہونے باوجود ان سے درگذر کرنا ، انتقامی جذبے سے مغلوب نہ ہونا ، یہ بھی حسنِ سلوک ہے اور اس کے لئے آخرت میں بڑا اجر ہے ۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"وجزاء سیئة مثلها ۔ فمن عفا و اصلح فاجره علی اللہ ۔ انه لا یحب الظالمین" (۴۲ : ۴۰)

یعنی برائی کا بدلہ اس کے مثل برائی ہے ، پس جو کوئی اس برائی کرنے والے کو معاف کردے اور صلح و صفائی کرلے ، اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے ۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ۔
ایک اور جگہ "والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس" کے الفاظ میں غصہ

پی جانے والوں اور لوگوں کو معاف کر دینے والوں کو محسنین فرمایا گیا اور یہ کہا گیا کہ اللہ محسنین کو دوست رکھتا ہے ۔ یہاں محسنین سے نیکوکار اور سلوک و احسان کرنے والے لوگ مراد ہیں ۔ یہ ایک اعزاز و انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوستی اور پسندیدگی کے شرف سے نوازتا ہے ۔ ایک اور جگہ قرآن پاک میں ارشاد ہے ؛۔

"ادفع بالتی ھی احسن"

کہ برائی کو نیکی کے ذریعہ رد کرو، برائی کا جواب بھلائی سے دو، یعنی کوئی تمہارے ساتھ برائی کرے، تم اس کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک اختیار کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا بھی صدقہ یعنی خیر و نیکی ہے ۔ ایک مرتبہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے ۔ ایک شخص آیا تو آپ نے اپنے جسم کو حرکت دی اور کچھ تھوڑے سے سمٹ گئے ۔ اس شخص نے عرض کیا ۔ یارسول اللہ! جگہ تو کشادہ ہے! آپ نے فرمایا کہ مسلمان کا یہ حق ہے کہ جب اس کا بھائی اسے دیکھے تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ اپنے جسم کو حرکت دے ۔ اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے ایک مسلمان کے دل میں گنجائش ہونی چاہیے اور جب اس کو دیکھے تو اس میں ایک استقبالی کیفیت پیدا ہو، اس کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہو کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا ہے ۔ یہ بھی حسن سلوک کا ایک درجہ ہے ۔

اسلام انسانی نفس کو عقل و ایمان کے تابع رکھنا چاہتا ہے ۔ وہ اسے مادی اور روحانی دونوں طرح کی ایسی تعلیمات و اخلاقیات سے آگاہ اور ایسے اعمال حسنہ سے بہرہ مند دیکھنا چاہتا ہے جو اسکے لئے دنیاوی زندگی میں بھی مفید ہوں اور آخرت کے لئے زادِ راہ بھی بن سکیں ۔ ان ہی اعمال حسنہ میں سلوک و احسان بھی شامل ہے ۔ حسن سلوک سے اچھے نتائج انسان کی اپنی زندگی ہی میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور آخرت میں اس کے لئے جو اجر ہوگا وہ علیحدہ ہے ۔

چنانچہ اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دوستوں ، ملنے

جلنے والوں، ہمسایوں، اعزاز و اقارب، اجنبیوں، محتاجوں اور مسکینوں بلکہ دشمنوں تک سے حسنِ سلوک اختیار کریں۔ اسلام انسانی زندگی میں حسنِ سلوک کو بطور ایک بنیاد کے قرار دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنی تعلیم کی انتہا اور کمال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں یعنی بتوں کو، ان کو بھی برا نہ کہو بلکہ حکمت و موعظت کے ذریعہ ایسا طریقہ اختیار کرو جو "احسن" ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"لیبلوکم ایکم احسن اعملا"

یعنی اللہ نے ہمیں یہ حیات اسی لئے بخشی کہ موت کے بعد آخرت کے دن ترازو میں جانچے اور تولے کہ ہم میں سے کون عمل کے اعتبار سے "احسن" رہا۔ کون اپنی زندگی میں سلوک و احسان کو اختیار کئے رہا۔ گویا حسن عمل اور حسنِ سلوک ہی زندگی کے امتحان میں کامیابی کی کنجی ہے۔

حصولِ علم

"علم" کے لفظی معنی "دانستن" یعنی "جاننے" کے ہیں لیکن اصطلاحاً اس سے مراد "حقیقت اشیاء کا جاننا" ہے۔ "علم" اور "صنعت" دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ البتہ "علم" "صنعت" میں داخل ہے جبکہ "صنعت" علم سے ممیّز ہے۔

کتابی علم کی ترقی کے اس دور میں شاید ہی کوئی انسان ہو جو حصول علم کا مخالف اور اسکی اہمیت کا منکر ہو۔ اس لئے اصل سوال علم کے حصول کا نہیں بلکہ علم کی تشخیص اور تعیّن کا ہے جس کو حاصل کیا جائے، بلکہ جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے۔

علم ہی کے سبب انسان کو ملائکہ پر فضیلت بخشی گئی۔ اور موجودات عالم کا اسے محرم بنایا گیا۔ علم ہی کی بدولت اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض کا عظیم الشان منصب سونپا گیا۔ علم و طاقت ہی ملکی سرداری و سربراہی کا سرچشمہ قرار دیئے گئے۔ علم آدمی کو انسان بناتا ہے جو علم آدمی کو انسان نہ بنائے، ظاہر ہے کہ وہ علم وہ نہیں جس کا حصول فرض کیا گیا ہے۔

علم کا حصول اسی بنیادی انسانی مقصد کے تحت ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اگر انسان ایسا علم حاصل کرتا ہے جو اس کو انسانیت کے درجے سے گرا دے یا انسان کے درجے سے بڑھا کر اس سے خدائی کا دعوی کرا دے تو ظاہر ہے کہ یہ وہ علم نہیں جو اللہ کو مطلوب ہے، جو انسان کا خاص شرف ہے، جو اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مستحق بناتا ہے۔
اسی لئے علم کے حصول میں بنیادی مسئلہ علم کی تشخیص و تعیین کا ہے جیسا کہ اوپر عرض

کیا گیا ہے۔

انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کا علم وعرفان حاصل کرے، کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ کہاں جائے گا؟ اس کا خالق کون ہے؟ لازمی طور پر اس کا ذہن کائنات میں پھیلی ہوئی آیات اور نشانیوں کے ذریعے ان سب کے خالق کی طرف منعطف ہو گا۔ یہیں سے علم کی صحیح تشخیص اور تعیین کا مرکزی نقطہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی علم معرفت کردگار، علم معرفت الٰہی ـــــ جب اسے اللہ کی ذات وصفات کا علم یقین حاصل ہوگا تو اسے اپنی ذات اور اس کے فانی وجود اور اس کے مقتضیات کا بھی علم ہو جائے گا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے۔ "من عرف ربه فقد عرف نفسه" ـــــ جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس نے اپنے نفس کو جان لیا۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کو بنیادی طور پر ان علوم کو حاصل کرنا چاہیئے جو اسے اس کے خالق اور اس کے منشاء تخلیق سے متعارف کرا سکیں۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ وہ کتابیں جو انسانوں نے لکھیں اور وہ علوم جو انسانی دماغوں نے ایجاد کئے خطا و صواب کے احتمال سے پُر ہیں۔ اس لئے صحیح ترین ذریعۂ علم "وحی" ہے جو کتب سماویہ کی صورت میں اللہ کی طرف سے انسان کی ہدایت و راہ بری کے لئے نازل کی جاتی رہیں۔ خاتم النبیّین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپؐ پر نازل کی ہوئی آخری کتاب ہدایت "قرآنِ مجید" ہے جو ساری انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک کے لئے آخری کتاب ہدایت ہے جس میں کسی قسم کے شک و تردّد کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں، اس لئے اسی کتاب قرآن کا علم انسان کے لئے صحیح ترین ذریعۂ علم ہے، جس کا حصول اس پر فرض ہے۔ اس کی صحیح ترین تعبیر و تشریح کے لئے احادیث و سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر ایک انسان کے لئے اپنے منشاء تخلیق کو معلوم کرنے اور اس کی تحصیل و تکمیل کے لیے میدان حیات میں گامزن ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ قرآن وحدیث

کی روشنی میں اپنے سفر علم کا آغاز کرے ۔ اس سے عقائد کی درستی اور اعمال کی صلاحیت پیدا ہوگی اور سیرت انسانی میں ایک توازن اور جمال پیدا ہوگا ۔

قرآن وحدیث ہی کے مطالعے سے یہ معلوم ہوگا کہ تمدنی انسانی زندگی کے قیام اور ارتقاء کے لئے صنائع کا علم بھی ضروری ہے ۔ ان صنائع کے جانے بغیر انسان اپنی معاش کے حصول اور تمدنی ضروریات کی تکمیل پر قادر نہیں ہوسکتا اور آفات ارضی و سماوی سے محافظت ممکن ہوسکتی ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ صنائع اور فنون سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم بھی ضروری ہے جو انسان کی زندگی اور قوت کا سبب بنتے ہیں ، کیونکہ اگر جسم میں قوت نہ ہوگی تو پھر علوم کا حصول کیونکر ہوگا ؟ ــــــ اللہ کی طرف سے بندے کے ذمہ جو فرائض عائد کئے گئے ہیں ان کی تکمیل کیونکر ہوگی ؟ البتہ یہ سائنسی اور ٹکنیکی علوم و فنون بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک بہتر تمدنی زندگی کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں ۔علم کی اصل غایت یہ ہونی چاہئیے کہ خدا اور بندے کے باہمی تعلق کو استوار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو ۔ ایسا علم جو اس تعلق کو پیدا نہ کرے یا کمزور کردے یا جس علم کے حصول سے خشیت پیدا نہ ہو ، اللہ کا خوف پیدا نہ ہو ، قرآن حکیم کی روشنی میں علم مطلوب نہیں " انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء " اللہ کے عالم بندے ہی اس سے ڈرتے ہیں ۔

علم کا بنیادی مقتضیٰ عمل ہے ۔ قرآن وحدیث اللہ کے احکام جاننے کا یقینی ذریعہ ہیں ۔ اگر ہم ان کے ذریعہ حصول علم کے بعد بھی اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر نہ چلیں تو گویا ہمارے علم میں وہ یقینی کیفیت نہ پیدا ہوسکی جو عمل کو برانگیختہ کرنے کا باعث ہوتی ۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے قرآن وحدیث کو عربی ادب کی بہترین لازوال کتابوں کے طور پر پڑھا اور ہمارے قلب ان کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہی رہے ۔ کیونکہ علم کے بعد ہوا و ہوس کی غلامی ممنوع ہے ۔ راسخون فی العلم کے سینے نور تصدیق سے منور ہوجاتے ہیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ۔ " آمنا بہ کل من

عند ربّنا" سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے۔

اہل علم کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قرآن کی زبان میں "قائماً بالقسط" ہوتے ہیں۔ وہ عدل پر قائم رہنے والے ہوتے ہیں۔ عدل و انصاف ان کا شیوۂ زندگی اور طرز حیات بن جاتا ہے۔ ناانصافی اور ظلم شقاوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گویا صحیح علم کا حصول معاشرے میں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اہل علم کے درجات بلند فرماتا ہے۔

قرآن حکیم بلا علم بات کہنے یا بحث کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرماتا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی ۶۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "فلم تحاجوّن فیما لیس لکم به علم" بھلا تم لوگ اس امر میں جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں، کیوں حیل و حجت کرتے ہو؟ پھر ایک سو ستانویں (۱۹۷) آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "مالهم به من علم الّا اتباع الظن" کہ ان کے پاس اس امر کے بارے میں کچھ بھی تو علم نہیں، بس اپنے گمان و خیال کی پیروی کئے جاتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے۔ "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" کہ تمہیں علم کا بہت تھوڑا حصہ عطا کیا گیا ہے۔

آجکل ہم میں سے بہت سے لوگ بلا صحیح علم کے بحث و مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ صورت نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی امور میں بھی ناپسندیدہ ہے۔ اس سے معاشرے میں بے اطمینانی اور انتشار پیدا ہوتا ہے جو اجتماعیت کے لئے نقصان دہ اور مضرت رسان ہے۔ بالخصوص دین کے معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہماری ذرا سی غلطی سے لوگوں کے دین و ایمان خطرہ میں پڑ سکتے ہیں۔

حقوق العباد

دین اسلام محض عقائد و عبادات کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مکمل اور جامع نظام حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو اور ہر ہر رخ کے لئے ابدی ہدایات و احکام موجود ہیں۔ چنانچہ اسلام اپنے معاشرتی نظام میں "حقوق العباد" کی ادائی پر بہت زور دیتا ہے۔

اسلام میں حقوق کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ ایک "حقوق اللہ" جو انسان پر فطرتاً عائد ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسرے "حقوق العباد" جو اللہ کے بندے ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے پر واجب ہیں، اور

۳۔ تیسرے "حقوق کائنات" یعنی انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات کے حقوق مثلاً جانوروں کا انسان پر یہ حق کہ ان کی طاقت برداشت سے زیادہ کام نہ لیا جائے، یا انہیں بھوکا پیاسا نہ رکھا جائے، یا پانی کا یہ حق ہے کہ اسے ضائع نہ کیا جائے۔

ان تینوں حقوق میں معاشرتی نقطۂ نظر سے "حقوق العباد" کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس کی اہمیت کے ثبوت کے لئے صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت اپنے حقوق، جو بندے کے ذمہ ہیں، معاف کر دے گا مگر بندوں کے حقوق، جو ایک دوسرے پر واجب ہوں گے، انہیں معاف نہیں کرے گا۔

"حقوق العباد" کا سلسلہ دراصل اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ایک شخص خدا کی زمین پر ایک انسانی سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ماں کے پیٹ میں

اس کے خون سے پرورش پانے سے لیکر پیدا ہونے اور مرجانے کے بعد تجہیز وتکفین تک باقی رہتا ہے۔ اس دوران ایک انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بے شمار افراد اور مختلف اداروں سے مختلف صورتوں میں متمتع اور مستفید ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے درجے کے اعتبار سے اس کے ذمہ بہت سے افراد اور اجتماعی اداروں کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔

دراصل اسلام اجتماعی اور معاشرتی حقوق کا ایک وسیع تصور رکھتا ہے، چنانچہ "حقوق العباد" میں وہ سب سے پہلے والدین اور اولاد کے حقوق وفرائض پر زور دیتا ہے۔ والدین کی نافرمانی اور ان کے حقوق ادا نہ کرنے کو اللہ کے ساتھ شرک کے بعد دوسرا بڑا گناہ قرار دیتا ہے کیونکہ والدین کے ادب واحترام، اطاعت وفرمانبرداری اور احساس تشکر واحسان مندی کے بغیر خاندانی زندگی مستحکم اور خوشگوار نہیں ہوسکتی، جو نتیجہ کے طور پر پوری سوسائٹی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

والدین اور بیوی بچوں کے حقوق کے بعد دوسرے لوگوں کے حقوق کا درجہ ہے۔ مثلاً رشتہ داروں کے حقوق، ہمسایوں کے حقوق، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق، سائلوں اور مسافروں کے حقوق، ملازموں اور قیدیوں کے حقوق۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیت اور کمائی ہوئی دولت کو صرف اپنی ذات ہی کے لیے محدود اور مخصوص نہ کرلے بلکہ وہ اپنی ضرورتیں اعتدال کے ساتھ پوری کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجتمندوں کے حقوق بھی ادا کرے، تاکہ سوسائٹی میں امدادِ باہمی، ہمدردی اور تعاون، حق شناسی اور حق رسانی کی روح جاری و ساری ہو۔ اور معاشرے میں "حقوق العباد" کا تصور عملی طور پر ایسا وسیع اور ہمہ گیر ہو کہ ہر شخص کو اپنی ذات اور اپنے مال پر دوسرے انسانوں کے حقوق کا ادراک حاصل ہو اور لوگ ان حقوق کو سمجھنے اور بلا کسی خارجی دباؤ کے خود بخود ادا کرنے لگیں۔

اسلام میں کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حقوق و فرائض کا افراط وتفریط سے مبرا ایک مربوط اور متوازن نظام موجود ہے۔ قرآن پاک

"حقوق العباد" کی ادائیگی پر ایک دوسرے کو اکساتا ہے اور انسان کی اخلاقی حس کو بیدار اور متحرک دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ "حقوق العباد" کا ادا کرنا مومنوں کی صفت قرار دیتا ہے، اور ایمان کے ساتھ "حقوق العباد" کو ادا کرنے کو نجات کا ذریعہ کہتا ہے۔ حقداروں کو محروم کر کے مرنے والے کی میراث سمیٹنے کی مذمت کرتا ہے اور دوسروں کا حق مارنے والوں کو انجام بد سے ڈراتا ہے۔

کاش! ہم مسلمان اللہ اور اس کے رسولؐ کے ماننے والے "حقوق العباد" کی اہمیت کو سمجھیں اور معاشرے کے عام حقوق کی خلاف ورزی مثلاً چوری، خیانت، ظلم، ناانصافی، چوربازاری، کم ناپ اور تول، اور دوسروں کا مال ہڑپ کر جانے کی قبیح عادتوں سے اجتناب کریں اور اس طرح دنیا سے رخصت نہ ہوں کہ ہماری گردنیں سینکڑوں، ہزاروں انسانوں کی حق تلفیوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہوں اور ہم میدانِ حشر میں اللہ اور اس کے محبوب کے سامنے خالی ہاتھ شرمسار و سرنگوں کھڑے ہوں۔

حقوقِ والدین

والدین کے حقوق کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی سورت بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۲۳،
۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"وقضیٰ ربکَ الاّ تعبدوا الاّ ایاہُ ، وبالوالدین احساناً ط اِمّا یبلغنّ
عندکَ الکبَرَ اَحدُھما اَوْ کلاھُما ، فلا تقل لھما اُفٍ ولا تنھر
ھما وقل لھما قولاً کریما (۲۳) واخفض لھما جناح الذُلِّ من
الرحمۃ وقُل ربّ ارحمھما کما ربّینی صغیراً" (۲۴)

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اسی
کی۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک
یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ
ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر
رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار، ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت
کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

آگے ارشاد ہوتا ہے :۔

"ربکُمْ اَعْلَمُ بما فی نفوسِکم ط اِن تکونوا صٰلحِین فانّہ کان
لِلاوّابینَ غفوراً" (۲۵)

تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو
تو وہ ایسے سب لوگوں کے لئے درگزر کرنے والا ہے، جو اپنے قصور پر متنبّہ ہو کر

بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

اسلام میں والدین کے حقوق کی اہمیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ بیان کردہ پہلی آیت (نمبر ۲۳) سے معلوم ہوتا ہے۔ اپنی بندگی اور اطاعت و فرمانبرداری کے فوراً بعد بلکہ اس سے متصل، اسی آیت میں والدین کی اطاعت، خدمت گزاری اور ادب شناسی کا حکم دیا ہے اور اس کی اہمیت یوں اور بھی واضح ہوتی ہے کہ دونوں امور یعنی اللہ کی بندگی اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کے لئے " قضیٰ " کے لفظ سے آغاز فرمایا گیا، کہ تمہارے رب کا یہ فیصلہ ہے جس میں کسی چون وچرا اور لیت ولعل کی ذرہ برابر گنجائش نہیں۔

جو لوگ اسلام کے معاشرتی نظام سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، ان سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ اسلام معاشرہ کے سب سے چھوٹے یونٹ یعنی خاندان کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک خاندان کی اہمیت عمارت کے ستون کی طرح ہے، جس پر عمارت قائم رہتی ہے۔

اسلام خاندان کے ادارہ کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس دنیا کو وہ ایک اجتماعی نظام دیتا ہے جو اولاد کو والدین سے بیگانہ، لاتعلق اور بے نیاز نہیں بناتا بلکہ ان میں اپنے والدین کے لئے احسان مندی اور احترام و اکرام کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اسے پروان چڑھاتا ہے۔ اور بڑھاپے میں اسی طرح ان کی خدمت کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ جس طرح بچپن میں وہ اس کی پرورش و پرداخت کر چکے ہیں۔

یہاں اس آیت میں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ لفظ " رب " کا استعمال ہے — ارشاد ہوتا ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے والدین کے ساتھ احسان — اللہ جو سارے عالمین کا " رب " " پروردگار " اور پالنے والا ہے، اسی طرح باپ و ماں میں بھی اس صفتِ ربوبیت کا پرتو اس طور پر پایا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے بچہ کی زندگی کی تمام ضروریات کو اس کی ارتقاء پذیر زندگی کے ساتھ پورا کرتے ہیں، اور جیسے جیسے بچہ بڑھتا جاتا ہے، ویسے ویسے اس کی پرورش و پرداخت میں حسبِ ضرورت مصروف

ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس کی پرورش شیر خوارگی کے زمانہ سے لیکر جوانی تک حسبِ اقتضاء حال کرتے رہتے ہیں۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے، جیسا کہ سورۃ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

"اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ"

یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جلّ شانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی طرح والدین کا شکر گزار ہونا واجب ہے۔

والدین کی خدمت و اطاعت والدین کی حیثیت سے کسی زمانہ اور عمر کے ساتھ مقید اور مشروط نہیں اور یہ جو آیت میں بڑھاپے کی عمر کا ذکر ہے تو یہ شاید اس لیے کہ بڑھاپے میں انہیں اپنی اولاد کے حسنِ سلوک کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں اولاد کی بے رخی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس لیے تنبیہ کی جا رہی ہے کہ قولاً و فعلاً، اشارۃً و کنایۃً، غرض کسی طرح بھی انہیں تکلیف نہ دی جائے۔ حتیٰ کہ ان کے سامنے کلمۂ اُف تک نہ کہا جائے جس سے ان پر اپنی ناگواری کا اظہار ہوتا ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانو! اپنے والدین کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو تاکہ تمہاری اولاد بھی تمہارے ساتھ نیکی سے پیش آئے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے۔ جس میں فرمایا گیا کہ کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا ہے۔

مستدرک حاکم میں ایک حدیث مذکور ہے کہ ہر گناہ کے بدلہ میں عذاب اور ہر جرم کے مقابلہ میں سزا کو مؤخر کیا جا سکتا ہے، لیکن ماں باپ کی نافرمانی کا گناہ ایسا سخت

ہے کہ اس کا مؤاخذہ زندگی ہی میں ہو جاتا ہے۔

اور یہ بات تو ہمارے اور آپ کے مشاہدہ میں آئی ہو گی کہ جو لوگ اپنے والدین کو تکلیفیں پہنچاتے ہیں، ان پر ظلم کرتے ہیں، ان سے مقدمہ بازی کرتے ہیں، ان کے درپے آزار ہوتے ہیں، خود ان کی اولاد بھی ان کی نافرمان نکلتی ہے اور آخر عمر میں وہ بھی بے چارگی اور کسمپرسی کے ساتھ زندگی کا ایک ایک دن گن گن کر کاٹتے ہیں۔

بیہقی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی بندۂ خدا زندگی میں ماں باپ کا نافرمان رہا اور والدین میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا اسی حال میں انتقال ہو گیا یعنی وہ اولاد سے ناراضگی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوتے تو اب اس کو چاہئے کہ وہ اپنے والدین کے لیے برابر دعا کرتا رہے اور خدا تعالیٰ سے ان کی بخشش کی درخواست کرتا رہے، یہاں تک خدا اس کا نام اپنی رحمت سے نیک لوگوں کی فہرست میں لکھ دے۔

والدین کے ساتھ جس حسن سلوک کا حکم قرآن و حدیث میں دیا گیا ہے، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ جن لوگوں سے والدین کی قرابت یا دوستی تھی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرنا چاہیے، خصوصاً والدین کی وفات کے بعد —— صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "باپ کے ساتھ بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے"۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک انصاری شخص آیا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی ان کا کوئی حق میرے ذمہ باقی ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں! ان کے لئے دعا اور استغفار کرنا، اور جو عہد انہوں نے کسی سے کیا تھا، اس کو پورا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا اور ان کے ایسے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا جن کا رشتۂ قرابت صرف انہیں کے واسطے سے ہے۔ والدین کے یہ حقوق ہیں جو ان کے مرنے کے بعد بھی تمہارے ذمہ باقی ہیں۔

اور آنحضرتؐ کا یہ ارشاد "انت ومالک لابیک" تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے ـــــ والدین کے حقوق کا نقطۂ کمال ہے، اور ایسا بے نظیر منشور ہے۔ جس کی جتنی بھی تعبیریں اور تفسیریں کی جائیں کم ہیں۔

ان مغرب پرستوں کے لئے جو اپنے بوڑھے والدین کو اپنے سے علیحدہ مرکزوں (OLD HOUSES) میں زندگی کے آخری دن حسرت و تنہائی میں گزارنے اور بالآخر مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ خود ان کی اپنی رنگ رلیوں اور دنیاوی دلچسپیوں میں کوئی فرق نہ آنے پائے، اسلام کی یہ تعلیم تازیانۂ عبرت ہے۔

دیانت

اسلامی اصول فقہ میں دیانت کا لفظ قضاء یعنی حکم حاکم کے برخلاف اس باطنی، قلبی، روحانی یا ذہنی و فکری کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے۔ جس سے اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا بڑا تعلق نیت بلکہ حسنِ نیت سے ہے۔ انسان کے عمل کے درپردہ جو باطنی غرض پوشیدہ ہوتی ہے اس کا علم اللہ کو ہوتا ہے، گو وہ غرض دوسرے انسانوں کی ظاہری نگاہوں سے مخفی ہوتی ہے۔ معاملات کی اصطلاح میں دیانتداری ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو تزکیۂ نفس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کو ہم "تقویٰ" کا ایک پہلو یا ایک جزو بھی کہہ سکتے ہیں۔

دیانتداری نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام نظام ہائے اخلاق کا ایک لازمی اور بنیادی جزو ہے۔ دراصل دنیا کا کوئی نظام خواہ سیاسی ہو یا معاشرتی، اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک اس کی بنیاد "دیانتداری" اور راست بازی پر نہ ہو۔ ماہرین اخلاقیات اس امر پر متفق ہیں کہ انسانی معاشرہ کو حرکت، ترقی اور امن و سکون و خوشحالی سے ہمکنار کرنے والی اگر کوئی قوت نافذہ مثبت طور پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ "دیانتداری" ہے۔ دیانتداری نظامِ اخلاق کا ایک امتیازی ستون، ایک امتیازی خصوصیت اور ایک امتیازی وصف ہے۔

"دیانتداری" جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ایک مثبت اخلاقی صفت ہے اس کا اطلاق صرف مالی امور تک محدود نہیں بلکہ انسان کی تمام تر زندگی کو اپنے دائرہ میں لئے ہوئے ہے، خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی معاشرتی ہو یا اقتصادی۔ چنانچہ اگر کوئی

شخص کسی کام کا ذمہ لیتا ہے اور وہ اس کام کو اپنی پوری توجہ اور تن دہی سے انجام نہیں دیتا تو اس کا یہ فعل دیانتداری کے خلاف ہے یا اگر کوئی شخص ملازم ہے، وقت مقررہ کے بعد آتا ہے اور وقتِ مقررہ سے پہلے چلا جاتا ہے تو اس کا یہ فعل دیانتداری کے خلاف اور اس کی کمائی درجۂ حلال سے محروم ہو جائے گی۔ کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل ظاہر کر کے کوئی منصب حاصل کر لے درآنحالیکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اس منصب کا اہل نہیں تو اس کا اس منصب پر فائز رہنا دیانتداری کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی حاکم جان بوجھ کر کسی نااہل شخص کو کوئی ایسا منصب اور عہدہ سونپے جس کا وہ شخص اہل نہ ہو تو حاکم کا یہ فعل دیانتداری کے خلاف اور عامۃ المسلمین کے حق میں خیانت قرار پائے گا۔ اسی طرح کسی کو دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینا، معاملہ میں حق کو چھپانا، یا حق کو بدل ڈالنا یا حق و باطل کی آمیزش کرنا، یہ سب باتیں دیانتداری کے خلاف ہیں اور یہ تو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی، ملاوٹ اور ناقص مال اچھا کہہ کر فروخت کرنا، دیانتداری کے عام اور روزمرہ تقاضوں کے خلاف ہے۔

اسلام ایک انسان سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ دیانتداری کے تمام قاعدوں اور ضابطوں سے تجاوز نہ کرے گا۔ وہ اس دنیا کے تمام بسنے والوں کو سچائی اور دیانتداری کی تعلیم دیتا ہے۔ انہیں حق و دیانتداری اور سچائی پر متحد اور مجتمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ سچائی اور دیانتداری کے معنی ہیں۔ خود غرضی اور نفس کی خواہشوں کو رد کرنا، اور تمام تر مصیبتوں اور صعوبتوں کے باوجود حق کے راستہ پر جمے رہنا اور دیانتداری کو اختیار کئے رہنا۔ اسلام ایک مسلمان کو زندگی کے ہر قدم پر دیانتداری کے نگہبان کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جہاں کہیں جھوٹ، دھوکہ، فریب اور خود غرضی ہو اس کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہے اور ایک دیانتدار معاشرہ کا قیام امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کہیں برائی دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ یعنی زور و قوت سے روکے اور ختم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر اس

کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس ظلم و برائی کے خلاف احتجاج کرے۔ اگر اس کے لئے ایسا کرنا مشکل اور دشوار ہو تو کم از کم دل سے اس برائی کو برا جانے، یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔

ایک مسلمان اس بات کا مکلف ہے۔ یعنی اس پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ کسی معاملہ میں حق و دیانت کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ اور جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ حق و دیانت کس طرف ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کا عملاً ثبوت دے کہ وہ حق و دیانت کو قبول کرتا ہے اور اس کی حمایت کرتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

۱۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔

۲۔ جب کسی سے کوئی وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور

۳۔ جب کسی چیز کا امانتدار بنایا جائے تو خیانت کرے۔

اگرچہ اس حدیث میں منافق کی تین علامتیں بتائی گئی ہیں لیکن ان تینوں امور میں جو بات مشترک ہے وہ عدم دیانت ہے یعنی اس شخص کی بددیانتی۔ ایسا شخص موقع پرست ہوتا ہے۔ اپنی مطلب برآری کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے۔ ملک و ملت سے سچی وفاداری اور اس وفاداری کی راہ میں ہر طرح کی قربانی کو ایک حماقت تصور کرتا ہے اور اخلاقی ضابطوں سے آزاد ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ ہے کہ آخرت میں ہمیں اپنے تمام اقوال و افعال کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔ "ایحسب الانسان ان یترک سدیٰ" "کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یونہی مہمل اور بے سود و بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔ اور اس سے اس کی ذمہ داریوں کا کوئی حساب نہ لیا جائے گا ——— نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ" "جو کوئی ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا۔ اس کو آخرت میں اپنے لئے موجود پائے گا اور جو کوئی اس حیات دنیوی میں ذرہ برابر برائی کریگا، وہ اس برائی کا بدلہ آخرت میں ضرور پائے گا۔

عمل میں خیر و دیانت کی بنیاد، اسلامی نقطۂ نگاہ سے، عقیدہ کی درستی اور اخلاقی ذمہ داریوں کا ہر لحظہ احساس ہے۔ جس شخص میں اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس نہیں، وہ انسان نہیں بلکہ جانور ہے۔ دیانت انسان کا جوہر آدمیت ہے۔ عمل میں دیانت اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان میں خود شناسی اور خدا شناسی ہو اور آخرت میں جواب دہی کا یقین ہو۔ حدیث میں احسان کا جو لفظ آیا ہے وہ کسی حد تک دیانتداری کے مترادف کہا جا سکتا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ عمل کرو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو تم دیکھ رہے ہو، اور یہ نہ ہو تو کم از کم یہ استحضار تو ہو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ درحقیقت یہ حدیث دیانت کے اعلیٰ تصور کو چند لفظوں میں پیش کرتی ہے۔ جس کی جتنی بھی شرحیں کی جائیں کم ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تم سچائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ بولو۔ کیونکہ سچ بولنا نیکی کے راستہ پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے اور آدمی جب ہمیشہ ہی سچ بولتا ہے اور سچائی ہی کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ مقام صدیقیت تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کے ہاں صدیقین میں لکھ دیا جاتا ہے۔ —— اور جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستہ پر ڈال دیتی ہے اور بدکاری اس کو دوزخ تک پہنچا دیتی ہے، اور جو آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور جھوٹ کو اختیار کر لیتا ہے تو انجام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں کذابین میں لکھ لیا جاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ ارشاد تو ہم تقریباً ہر جمعہ کے خطبہ میں سنتے ہیں کہ "جس میں دیانت و امانت نہیں اسکا ایمان نہیں"! اور یہ کہ "سچ باعثِ نجات اور جھوٹ موجب ہلاکت ہوتا ہے"!

روحِ مساوات

یہ اصول ماہرین عمرانیات کے نزدیک مسلّم ہے کہ ہمارے تمام نظریے یعنی (Doctrines) ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی عظیم کائنات کے اس تصور (concept) کے تابع ہوتے ہیں جو ہم کائنات کے بارے میں رکھتے ہیں۔ ایک دہریہ (Atheist) جو کائنات کے وجود کو محض ایک امر اتفاقی خیال کرتا ہے اس کے نظریات عام انسانی زندگی کے بارے میں اس مذہبی انسان سے یقیناً مختلف ہوں گے جو اس کائنات کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق سمجھتا ہے۔ اسی طرح کسی اصطلاحی لفظ کا مفہوم بھی اس نظریہ کی روشنی میں سمجھا جائے گا جس نظریہ کا وہ شخص قائل ہے۔ مثال کے طور پر لفظ مساوات کا اصطلاحی مفہوم زندگی کے بارے میں مختلف نظریات رکھنے والے دو اشخاص کے درمیان یقیناً مختلف اور متضاد ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جب پہلی بار مساوات کا نعرہ سرگوشیوں کی حدود سے نکل کر عوامی سطح پر بلند ہوا تو اس کی مختلف تفسیریں، تعبیریں اور توضیحیں کی گئیں۔ جب ان تعبیروں کے ڈانڈے اشتراکی نظریہ پر یقین رکھنے والوں سے ملتے گئے اور نظریاتی طور پر بات پیچ در پیچ ہوتی گئی تو وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے والوں نے اسے "مساوات محمدی" کا نام دیا۔ لیکن مساوات کی جو عملی شکلیں سامنے آئیں وہ نہ تو اسلامی مساوات تھی، نہ مساوات محمدی۔ ہاں اسے اس کو "خود ساختہ مساوات" ضرور کہا جا سکتا ہے۔

مساوات کے بارے میں اسلام کا سیدھا سادھا نظریہ یہ ہے کہ جن امور میں مساوات ممکن ہے ان میں مساوات قائم کی جائے اور جن امور میں مساوات ممکن نہیں،

ان میں مساوات کیونکر قائم رکھی جاسکتی ہے؟ مثال کے طور پر ایک انسان دوسرے انسان سے حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ انسان ہونے کے ناطے ہم سب برابر ہیں۔ کسی کی نسل، زبان، خطہ اور رنگ موجب افتخار نہیں، لیکن جسمانی اور دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر ایک مرد دوسرے مرد سے ممتاز ہے اور اسی لحاظ سے اس کے تحت پیدا ہونے والے ثمرات اور نتائج سے بہرہ ور ہونے کا امتیازی طور پر مستحق ہے۔ ایک فاسق اور دیندار، عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے لیکن عالم اور دیندار بننے کے مواقع کے حصول میں دونوں مساوی طور پر مستحق ہیں۔

اس بنیادی بحث کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ اسلام قانونی معاشرتی اور معاشی مساوات سے متعلق کیا نظریہ رکھتا ہے۔ قانونی مساوات کے ضمن میں مجھے ایک بات یاد آئی کہ ایک شخص کے بقول دستور پاکستان کے تحت مرد و عورت یکساں مقام کے حامل ہیں۔ اس لئے عورتوں کو بھی ملکی عہدوں میں برابر کا درجہ دیا جائے! یعنی اگر سو عہدے ہیں تو وہ مردوں اور عورتوں کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کئے جائیں۔ بالفرض مردوں اور عورتوں کی آبادی برابر ہے تو پھر ملکی ملازمتوں میں بھی یہ تناسب قائم کیا جائے۔ چنانچہ اس اصول کے پیش نظر کوئی وجہ نہیں کہ کمانڈر انچیف مرد ہی ہو، عورت بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مفروضہ قانونی مساوات کی غلط توجیہہ پر مبنی ہے۔ اسلام کی نظر میں قانونی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ قانونی حق کی چارہ جوئی اور حصولِ انصاف کے لئے سب کو یکساں طور پر عدالت سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ قانون کے تحت سب کو جانی و مالی اور عزت و آبرو کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ اسلام سب کے ساتھ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، غریب ہو یا مالدار، عام شہری ہو یا سرکاری عہدہ دار یکساں قانونی سلوک کا قائل ہے۔

اور جہاں تک معاشی مساوات کا تعلق ہے اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر جاندار کی معاشی ضروریات کی کفیل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا۔

وما من دابۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقہا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے تمام اسباب معیشت میں ہر جاندار کو یکساں طور پر مستفید ہونے کا مساوی حق حاصل ہے۔

انسان قرآن کی زبان میں "خلیفۃ اللہ فی الارض" ہے۔ اس پر اللہ کی جانب سے عائد کیے ہوئے احکام کی تنفیذ اور فرائض کی تکمیل کے لیے ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اس امر کا مکلّف ہے کہ وہ اللہ کے اس عہد اور اس کے منشاء کو پورا کرے۔ انفرادی طور پر اس طرح کہ اپنے زیردستوں اور زیر کفالت افراد کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا مناسب اہتمام و انتظام کرے، حتیٰ کہ ہمسایوں تک کی بنیادی ضرورت سے بے خبر نہ رہے۔ حدیث میں ایسے مسلمان کے لیے سخت وعید آئی ہے جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھاتے مگر اسکا پڑوسی بھوکا ہو۔ اجتماعی طور پر ایک اسلامی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی حدود مملکت میں بسنے والا کوئی فرد بلا قید مذہب و ملت حق معیشت سے محروم نہ رہے بلکہ ہر فرد کو اپنی روزی کمانے کا مساوی حق اور مواقع حاصل ہوں۔ تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اپنی روزی عزت اور سکون کے ساتھ حاصل کر سکے۔ اور جو لوگ معذور و اپاہج ہوں، یا ضعیف اور بے سہارا ہوں یا جن کی کفالت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ مثلاً نابالغ بچے اور بیوائیں۔ ان کے وظائف مقرر کرنا حکومت کے فرائض میں شامل ہے حتیٰ کہ معاشرہ کا کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم نہ رہے۔

لیکن معاشی مساوات کے ضمن میں یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ اگرچہ حق معیشت میں تمام افراد برابر ہیں اور اس کے درمیان کوئی تفریق و امتیاز نہیں لیکن درجات معیشت میں کسی معاشرہ یا مملکت میں رہنے والے افراد برابر نہیں ہو سکتے ورنہ ایک متمدن معاشرہ کبھی بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ درجات معیشت میں تفاوت ایک فطری تقاضہ ہے۔ درجات معیشت میں تفاوت خود قرآن پاک میں ان الفاظ میں

بیان کیا گیا ہے ۔

اَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۔

" کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرنا چاہتے ہیں ۔ دنیوی زندگی میں تو ان کی روزی ہم ہی نے تقسیم کر رکھی ہے ۔ اور ہم نے بعض کے درجے بعض پر بلند کر دیتے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے اور عالم کا انتظام قائم رہے " یعنی کسی کو غنی کر دیا کسی کو فقیر ۔ ایک کو بے شمار دولت دیدی اور دوسرے کو اس سے کم ، کوئی تابع کوئی متبوع ، ایک حاکم ہے دوسرا محکوم ۔

لیکن درجاتِ معیشت میں اس تفاوت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ معاشرہ کے کسی فرد کو اس کے بنیادی اور مساوی حق معیشت سے محروم کیا جائے اور ایک شخص دوسرے شخص کا استحصال کرے ۔ اس کی ناجائز فائدہ اٹھائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ معاشرہ کے لوگوں میں دولت کو مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے ۔ دوسرے لفظوں میں ایک شخص نے اپنی دیانت و محنت سے کوئی زمین یا جائیداد بنائی ہے یا کاروبار جمایا ہے ۔ آپ اس کو جبراً لیکر دوسروں میں تقسیم کر دیں گے تو اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ غاصبانہ عمل مساوات کے نام پر سراسر ظلم ہوگا ۔

چنانچہ اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر ایک معتدل و متوازن معاشی مساوات کا جو نظام ہمیں دیا ہے اس میں نہ تو فرد کے حق پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے ، نہ معاشرہ کی ضرورتوں سے چشم پوشی برتی گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا کاروبار جائز نہیں جس میں معاشی استحصال کی راہ کھل سکے ۔ یا عام معاشی بدحالی بلکہ بے اعتدالی وجود میں آئے یا معاشی ترقی کے لئے محنت وجدوجہد بے معنی ہو کر رہ جائے ۔ اسی لئے اسلام معاشی مساوات کو روبعمل لانے کیلئے اخلاقی اقدار کی ترویج پر زور دیتا ہے ۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے جب تک معاشی جدوجہد میں اخلاقی اصولوں کو برتری اور

فوقیت حاصل نہیں ہوگی بلکہ جب تک معاشی جدوجہد اخلاقی اصولوں کے تابع نہ ہوگی اس وقت تک قوم کی اجتماعی حالت اقتصادی زبوں حالی سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام باطل ذریعوں سے دولت سمیٹنے، اس کے ذخیرہ کرنے نیز سودی معاملات اور جوئے اور سٹے کے کاروبار کو سختی سے حرام قرار دیتا ہے، کیونکہ یہ سب طریقے مجبور اور ضرورت مند افراد کے معاشی استحصال کی علامتیں ہیں۔

اس تمام تر قانونی، معاشی اور معاشرتی مساوات کو ترازو کے پلڑوں میں برابر رکھنے کیلئے اسلام انسان کو آخرت پر ایمان کا عقیدہ دیتا ہے۔ جو درحقیقت انسان کے تمام تر دنیاوی اعمال و افعال اس کی نیتوں ارادوں اور غایات و مقاصد کیلئے ایک (Check and Balance) کا کام کرتا ہے۔ آخرت میں جوابدہی کا تصور اسے حرام و حلال میں تمیز یا معاشی بے راہروی اور غلط کاری سے بچاتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو ناجائز طور پر دبانے اور غصب کرنے سے باز رکھتا ہے۔ مختصر لفظوں میں اس بات کو یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ اسلام میں مساوات ایک ایسی اکائی ہے جو معاشی، قانونی اور معاشرتی نظریات کو اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اور یہی اسکا طرۂ امتیاز ہے۔ جب تک ہم قرآن حکیم کی اخلاقی، روحانی اور مذہبی قدروں پر یقین و ایمان نہیں رکھیں گے اور ان کو قرآن حکیم کے معاشی، قانونی اور معاشرتی نظریہ مساوات کی بنیاد نہیں بنائیں گے، خواہ آپ اس کا نام اسلامی مساوات رکھ لیں یا مساوات محمدی، اسکا حقیقی اسلامی مساوات سے کوئی واسطہ نہ ہوگا جو اسلام کی روح ہے۔

ظُلم

اہلِ لغت نے "ظُلم" کے حقیقی معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر تصرّف کرنا یا حد سے تجاوز کرنا ظلم ہے۔

ایک فقیہہ نے ظلم کو "وضع الشیی فی غیر محلہ" سے تعبیر کیا ہے کہ کسی شئے یا امر کا اس کے اپنے مقام سے غیر مقام پر رکھ دینا ظلم ہے۔

علّامہ راغب اصفہانی نے فرمایا ہے کہ ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ظلم کی وہ ہے جو انسان اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کرتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ خطرناک صورت کفر و شرک اور نفاق ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"انّ الشرکَ لظلم عظیم" شرک بلاشبہ عظیم ظلم ہے۔

ظلم کی دوسری قسم وہ ہے جو باہم انسانوں کے درمیان واقع ہو جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد کیا گیا ہے۔ "ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیّہ سلطناً" جس کو ظلم سے قتل کیا گیا تو مظلوم کے ولی کے لئے ہم نے قدرت دے رکھی ہے۔ یعنی اس کو مظلوم کے حق کی وصولی کا حق عطا کر دیا ہے۔

ظلم کی تیسری قسم وہ ہے جو خود انسان کی اپنی ذات میں واقع ہو یعنی ایک انسان خود اپنے جسم و جان کے ساتھ ظلم کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"فمنھم ظالم لنفسہ و منھم مقتصد"

ایک اور جگہ ارشاد ہے: "ومن یفعل ذالک فقد ظلم نفسہ" کہ جس نے اس فعل کا ارتکاب کیا اس نے اپنے نفس کے ساتھ زیادتی کی، حد سے تجاوز کیا۔

قرآن حکیم ظلم کے ان تینوں معنی کو اپنے اپنے موقع و محل کے اعتبار سے پیش کرتا ہے جس کے متعلق بکثرت آیات موجود ہیں ۔

اسلام ظلم کو مطلقاً حرام قرار دیتا ہے ۔ وہ ظلم کی کسی بھی صورت کو کسی بھی حالت میں جائز قرار نہیں دیتا ۔ اسلام ظلم کو دور کرنے کے لئے مظلوم کی حمایت و اعانت کو اجتماعی فریضہ قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی اس معاملے میں مظلوم کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے ساتھ بذات خود ایسا رویہ اور طریقہ اختیار کرے کہ ظالم آئندہ ظلم کرنے سے باز رہے ۔ چنانچہ قرآن حکیم باہم ایک دوسرے پر ظلم سے منع فرماتے ہوئے مظلوم کے حق میں نصیحت کے طور پر ارشاد فرماتا ہے ۔" انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق ، اولئک لھم عذاب الیم ۔ ولمن صبر و غفران ذلک لمن عزم الامور " یعنی وہ لوگ ملامت کے مستحق ہیں جو دوسرے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں ، اور روئے زمین پر ناحق زیادتیاں کرتے ہیں ، ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے ، البتہ جو مظلوم صبر سے کام لے اور درگذر کر دے تو یہ بڑی الوالعزمی کی بات ہوگی ۔

اس آیت کے آخری حصے میں مظلوم کو ایک ایسا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے جو ظالم کے مقابلے میں اس کی اعانت کا ذریعہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ کسی مظلوم کو اپنے ظالم سے انتقام لینے کا اگرچہ حق حاصل ہے ، لیکن اس کو انتقام لینے میں خود ظالم نہ بن جانا چاہیئے ۔ برائی کا بدلہ اگر دینا ہے ، تو اسی قدر جس قدر اس کے ساتھ برائی کی گئی ہے ۔

" جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا " برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی سے دیا جا سکتا ہے اس سے بڑھ کر دینا یہ مظلوم کی جانب سے خود ظلم ہوگا ۔ لیکن اس کے باوجود مظلوم کے لئے اس سے بہتر طریقہ جو اس آیت کے آخری حصے میں بیان کیا گیا ہے ، یہ ہے کہ ظالم کے مقابلے میں صبر کا تلخ گھونٹ پی کر درگذر کر دے ۔ ایسے مظلوم لوگوں کا شمار اولوالعزم لوگوں میں ہوگا اور ظالم دوسرے مواقع پر شرمندہ ہو کر اپنے ظلم سے باز آ

جائے گا۔ یہ مظلوم کی خود اپنے ساتھ اعانت ہوگی جو ظالم کے ترک ظلم میں ایک طرح سے معاون ثابت ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ "انصر اخاک ظالماً او مظلوماً" اپنے بھائی کی اعانت کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلعم) ظالم ہونے کی حالت میں کس طرح اس کی مدد کی جاسکتی ہے؟ فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو۔ یہی اس کی اعانت ہوگی۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیم میں "دفع ظلم" یعنی ظلم دور کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کا طریقہ ظالم کو ظلم سے روک دینے کی کوشش کرنا ہے۔ مظلوم کی حمایت سے ایک فرد کو فائدہ پہنچے گا۔ جب کہ ظالم کو ظلم سے روک دینے سے پورے معاشرے کو فائدہ پہنچے گا اور اس طرح دوسرے لوگ بھی ظالم کے ظلم سے محفوظ ہو جائیں گے اور امن میں رہیں گے۔

اسلام مظلوم کی حمایت پر انتہائی زور دیتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ کی ایک حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آنحضرت (صلعم) نے ارشاد فرمایا۔ "لعن اللہ عن رائ مظلوماً فلم ینصرہ" اللہ کی لعنت اس شخص پر ہے جو کسی پر ظلم ہوتے دیکھے اور پھر اس مظلوم کی اعانت نہ کرے۔

مظلوم کی حمایت کرنے سے نہ صرف انسان کا اپنا ضمیر مطمئن ہوجاتا ہے۔ بلکہ ایسا شخص خود اللہ تعالیٰ کی حمایت واعانت میں آجاتا ہے۔ چنانچہ مظلوم کی اعانت کرنے والے شخص کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"من اعان مسلماً کان اللہ فی عون المسلمین فما کان فی عون اخیہ"۔ جو شخص مسلمان کی اعانت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی اعانت اس وقت تک فرماتے رہیں گے جب تک وہ اس کی اعانت میں مشغول رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ مجھے ایک ماہ کے مسلسل نفلی روزے رکھنے اور بیت اللہ میں اعتکاف کرنے سے یہ زائد محبوب ہے کہ

میں کسی مسلمان کی حاجت میں اس کی اعانت کروں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے افضل وہ شخص ہوتا ہے جو عام طور پر سب کا خیر خواہ ہوتا ہے اور سب سے بڑا رتبہ اس شخص کا ہوتا ہے جو لوگوں کی غم خواری اور اعانت بخوبی کرتا ہے ۔

سنن بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " جو شخص کسی مظلوم کی حمایت اور دادرسی کرے اللہ تعالیٰ اس کیلئے بہتر بخششیں لکھ دیتا ہے ۔ جن میں سے ایک بخشش وہ ہے جو اس کے تمام کاموں کی اصلاح کی ضامن ہے اور باقی بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات بلند کرنے کا سبب ہوں گی "

عام طور پر اگر ظالم شخص ذی اثر اور بلند مرتبہ ہوتا ہے تو لوگ اس کے ڈر سے مظلوم کی مدد کرنے سے گریز کرتے ہیں ۔ ابو جہل کے ذمہ ایک شخص کا قرضہ واجب الادا تھا، وہ شخص جب بھی مطالبہ کرتا، ابو جہل اس کے ساتھ درشتی اور سختی کے ساتھ پیش آتا اور قرضہ ادا نہ کرتا ۔ وہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا ۔ آپ ابو جہل کے گھر پر تشریف لے گئے ۔ حالانکہ وہ آپ کا جانی دشمن تھا، دروازے پر دستک دی، ابو جہل باہر آیا تو اس سے دریافت کیا ۔ تم اس شخص کا قرضہ ادا کیوں نہیں کرتے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و امانت کا یہ اثر تھا کہ ابو جہل جیسے شخص سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اس نے اس شخص کا قرضہ فوراً ادا کر دیا ۔ اس واقعے سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو شخص مظلوم کی مدد کو اٹھے وہ خود ظالم اور دوسروں کے حق مارنے والا نہ ہو ۔ اس کی راست بازی اور نیک کرداری کا یہ اثر ہو کہ ظالم شرمندہ ہو کر ظلم سے باز آجائے ۔

عدل و انصاف

اسلام اپنے مخصوص مزاج کے اعتبار سے دیگر مذہبوں سے مختلف ہے۔ وہ دنیا اور دین کو دو علیحدہ اضافتیں تصور نہیں کرتا، بلکہ انسانی زندگی کو مجموعی طور پر ایک ناقابل تقسیم اکائی قرار دیتا ہے۔ وہ ایک مسلمان کا تعلق بیک وقت مادی ترقی اور روحانی ارتقاء دونوں سے قائم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ انسان کی فطری صلاحیتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے بیک وقت اس کی مادی و معاشی ضرورتوں کا بھی احاطہ کرتا ہے اور اس کی فکری اور روحانی سرچشموں کی بھی آبیاری کرتا ہے۔

اسلام ہی دنیا کا وہ واحد مکمل و اکمل دین ہے جو اپنے ماننے والوں کے لئے زندگی کے ہر گوشے اور ہر ہر پہلو میں ہدایات کا ایک جامع ذخیرہ لئے ہوئے ہے، خواہ وہ پہلو مسلمان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہو یا معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے خواہ وہ گوشہ تجارت و صنعت کا ہو یا تعلیم و اخلاق کا، قانون و سیاست کا ہو یا جنگ و حرب کا، داخلی امن و امان کا مسئلہ ہو یا خارجی پالیسی کا ـــــ اگرچہ زندگی کے ان گوناگوں پہلوؤں اور گوشوں کی تفصیلات اور جزئیات جدا جدا ہیں مگر ان میں دو بنیادی قدریں مشترک ہیں۔ ایک ایمان باللہ و ایمان بالرسالت اور دوسری عدل و انصاف اور مساوات ـــــ یہ دونوں قدریں آپس میں مربوط ہیں، وہ اس طرح کہ ایمان باللہ انسان کو خدا کے بتائے ہوئے طریقہ عدل اختیار کرنے کے لئے داخلی طور پر مجبور کرتا ہے اور عدل و مساوات کے قیام کا ذریعہ بناتا ہے، خواہ خارجی دباؤ کتنا ہی زور آور کیوں نہ ہو ـــــ اس طرح اندر کا انسان جو اپنے اندر ملکوتی صفات رکھتا ہے، باہر کے

انسان کی شیطانی خواہش کے آگے سپر انداز نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسلام اپنے ماننے والوں کے لئے صاف صاف تلقین کرتا ہے:۔

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔

کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم جادۂ انصاف سے ہٹ جاؤ، انصاف کرو، کہ انصاف ہی تقویٰ کی نزدیک ترین راہ ہے۔ یہاں تقویٰ سے مراد چند ظاہری مخصوص شکلوں اور طریقوں کی پابندی اور پیروی نہیں بلکہ تقویٰ سے مراد نفس کی وہ کیفیت ہے جو خدا ترسی، احساس ذمہ داری اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے زندہ ادراک اور احساس سے پیدا ہوتی ہے۔

اسلام معاشرہ میں عدل وانصاف اور توازن وہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلام میں عدل کی صرف ایک ہی قسم ہے۔ جس کو اجتماعی یا سماجی عدل کہا جاتا ہے، جس کو ہم انگریزی میں (Social Justice) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگرچہ عدل کی ایک معروف قسم قانونی عدل بھی ہے جس کو ہم (Legal Justice) سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن دراصل یہ عدل قانونی یا (Legal Justice) عدل کی کوئی مقصود بالذات اور علیحدہ قسم نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک طریقہ ہے، ذریعہ ہے اجتماعی عدل کے حصول کا ——— چنانچہ قانونی عدل کا طریقہ کار جتنا موثر، سہل، تیز، فعال اور مساویانہ ہوگا اسی قدر اجتماعی عدل قائم کرنے میں مدد ملے گی اور معاشرہ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں سے نکل کر ترقی وکامیابی کی کھلی شاہراہ پر گامزن ہو سکے گا۔

بدقسمتی سے برصغیر میں انگریزوں کے دور حکومت میں اسلامی نظام درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے اسلامی فکر اور اسلامی شریعت کے احکام اپنی اصلی ہیئت اور حقیقی شکل میں موجود نہ رہے اور جو کچھ اسلامی قانون نظر آتا ہے وہ اپنے عمل میں اسلامی رواج، فکر اور جذبہ سے خالی ہے۔ ہمارا موجودہ اجتماعی ڈھانچہ (Social Structure) اور عدالتی نظام وطریقہ کار انگریزوں کا ورثہ ہے جس کو ہم آزادی کی تہائی صدی گزر جانے کے باوجود اپنے سینوں سے چمٹائے ہوئے ہیں۔ انصاف میں تاخیر، آئے

دن کی پیشیاں، بے اندازہ خرچ، وکلار کی فیسیں، رشوت اور سفارش کا عمل دخل ایک عام آدمی میں یہ حوصلہ ہی نہیں پیدا کرتیں کہ وہ مروجہ طریقہ ہائے عدل وانصاف کے ذریعے اپنی سماجی ناہمواریوں اور ظلم وزیادتی کے مداوے کا طالب ہو۔ اس طرح معاشرہ میں دیکھتی آنکھوں انصاف کا خون ہوتا رہتا ہے۔ اسلام ظلم واستحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے ایسا جامع اور مربوط نظامِ عدل رکھتا ہے جس پر عمل کر کے ہمارے معاشرہ میں امن وامان اور خیر وبرکت کا ایک نیا سورج طلوع ہو سکتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:۔

"ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بہا الی الحکام،
لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون"

یعنی آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ اور ان کے جھوٹے معاملے کو حکام کے پاس اس طرح سے مت لے جاؤ کہ اس ذریعہ سے لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ کھا جاؤ، درآنحالیکہ تمہیں اس کا علم بھی ہو۔

اس آیت میں ظلم وزیادتی کے ساتھ مال کھانے کے دو طریقوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک یہ کہ انسان دوسرے انسان کے مال کو بلا حق وانصاف اپنے تصرف وقبضہ میں لے لے اور اس سے ناجائز انتفاع کرے۔ اور دوسرے یہ کہ عدل وانصاف کے نام پر معاملہ کو حاکم کے پاس اس غرض سے لے جائے کہ جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم یا رشوت کے ذریعے اپنے دوسرے بھائی کے مال پر ناحق قبضہ جما لے ــــ ان دونوں صورتوں میں ظلم واستحصال فروغ پاتا ہے اور عدل وانصاف کی بیخ کنی ہوتی ہے۔

اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت وضرورت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد معاشرہ میں عدل وانصاف کا قیام قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی پچیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ہم نے اتاری کتاب اور میزان یعنی قواعد عدل۔ تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام، انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح عدل پر قائم ہو۔ انفرادی طور پر انسان اپنے اور خدا کے حقوق اور دوسری طرف بندوں کے حقوق پورے انصاف اور نیک نیتی کے ساتھ ادا کرے اور اجتماعی زندگی کا نظام، ایسے اصولوں پر قائم کیا جائے کہ معاشرہ میں ظلم و تعدی، جارحیت اور زیادتی باقی نہ رہے۔ اجتماعی زندگی کے تمام پہلو افراط و تفریط سے خالی اور باہم متوازن ہوں اور معاشرہ کے تمام عناصر انصاف کے ساتھ اپنے حقوق پائیں اور اپنے فرائض ادا کریں۔

آج جو افراد یا ادارے انسان کی انفرادی زندگی اور معاشرہ کی اجتماعی زندگی کے نظام کو عدل قرآنی اور مساواتِ محمدی پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل وہ انبیاء علیہم السلام کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں بشرطیکہ جدوجہد اور سعی و کوشش ان جائز حدود کے اندر ہوں، جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ اسلام قیامِ عدل کا محض نظری اور فلسفیانہ طور پر قائل نہیں بلکہ وہ ہر مسلمان کے ذمہ یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ عدل کی حکمرانی کیلئے عملاً کوشاں رہے۔ وہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر آزاد، معاشی طور پر خود مکتفی اور جنگی طور پر ایک طاقتور قوم دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے معاشرہ میں فی الواقع عدل قائم کرنے کی قدرت حاصل ہو۔

ہم اپنے معاشرہ میں عام ملکی سطح پر ہرگز قرآنی عدل قائم نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ ہم پاکستان کو دشمنوں کے جارحانہ عزائم، استبدادی طاقتوں کی دست برد اور استحصال سے محفوظ نہ کر لیں۔ درحقیقت سیاسی و معاشی آزادی کے بغیر کوئی قوم اپنی اجتماعی قوتوں اور وسائل کا صحیح استعمال بلکہ ادراک بھی نہیں کر سکتی۔

عرفانِ نفس

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے " من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ "
کہ جس کسی نے اپنے نفس کو پہچان لیا، جان لیا، پس تحقیق اس نے اپنے رب، پالنے
والے کو پہچان لیا، جان لیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول اس لحاظ سے
بہت اہمیت رکھتا ہے کہ صنعت کی معرفت صانع کی دلیل ہے، جب تک کوئی
شخص صنعت کی معرفت حاصل نہ کرے گا، اپنے صانع، اپنے رب اور پروردگار اور
اپنے آقا کو کیسے پہچانے گا۔ اور جب تک پہچانے گا نہیں تو اس وقت تک ان
حقوق کی ادائیگی کی طرف کیسے متوجہ ہوگا اور ان فرائض کو کیسے پورا کرے گا جو اس
کے پالنے والے کی طرف سے اس کے ذمے عائد ہیں لیکن بات کو آگے بڑھانے سے
پہلے نفس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ نفس عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس
کے اصلی معنی " جان " کے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی ذات کے آتے ہیں۔ اس کے
ایک اور معنی سانس کے بھی آتے ہیں۔ قرآن حکیم نفس کے سلسلے میں تین اصطلاحیں
استعمال کرتا ہے:۔

۱۔ نفسِ امارہ۔

۲۔ نفسِ لوامہ۔

۳۔ نفسِ مطمئنہ۔

درحقیقت ہر آدمی کا نفس ایک ہی ہے لیکن اس نفس کی تین حالتوں کے
اعتبار سے اس کے تین نام ہو گئے ہیں، چنانچہ نفس اگر عالم علوی کی جانب مائل ہو اور

اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں اس کو مسرت اور خوشی حاصل ہوتی ہو اور شریعت کی پیروی میں اس کو سکون وچین محسوس ہوتا ہو، تو اس نفس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں ۔" یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الٰی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی "۔

یعنی اے نفس مطمئنہ ! اپنے رب کی طرف رجوع ہو تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی ہوا ۔ پھر شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں ۔

اور اگر نفس عالم سفلی کی طرف جھک پڑا اور دنیا کی لذتوں اور خواہشوں میں پھنس کر بدی کی طرف راغب ہوا اور شریعت کی پیروی سے بھاگا تو اس کو نفس امارہ کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو برائی اور بری باتوں کا حکم دیتا ہے ۔ اور اگر کبھی عالم سفلی کی طرف جھکتا ہے اور کبھی عالم علوی کی طرف مائل ہوتا ہے اور برائیوں سے گھبرا کر ان سے دُور بھاگتا ہے اور ان کی طرف آگے بڑھنے سے ہچکچاتا ہے ان کو برا جانتا ہے اور اپنی کوتاہیوں اور گناہوں پر دل سے شرمندہ ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے تو اس کو نفس لوامہ کہتے ہیں ۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :-

" ان النفس لامارۃ بالسوء " کہ نفس برائی سکھلاتا ہے ۔

نفسِ امارہ کا کام ہی شیطان کی پیروی اور اللہ سے روگردانی ہے ، اور یہ محض اللہ کی رحمت و اعانت ہی ہوتی ہے کہ نفس انسانی برائی سے رک جاتے ۔ چنانچہ نفس امارہ جب توبہ کر کے لوامہ بن جائے اور اپنی سابقہ تقصیرات پر شرمندہ ہو تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور پھر نفس انسانی آہستہ آہستہ ترقی کر کے نفس مطمئنہ کے درجے تک پہنچ جاتا ہے ۔

گناہوں سے بچنے اور نفس مطمئنہ حاصل کرنے کے لئے بنیادی چیز " عرفان نفس " ہے ۔ کہ انسان اپنی ذات کو پہچانے اور جونہی وہ اپنے نفس کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے ، تو اسی لمحے وہ عارف باللہ ہو جاتا ہے وہ یقین کی قوت کے ساتھ اللہ ہی کو اللہ جانتا ہے اور غیر اللہ سے اپنے دل کو خالی کر لیتا ہے ۔ عرفان نفس کا یہ درجہ

بالآخر تقرب الٰہی کا موجب ہوتا ہے، جونہی وہ عرفانِ نفس کے نتیجے میں نفس کی بے چارگی اور مسکنت سے واقف ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اللہ کو قادرِ حقیقی مانتا ہے۔ اسی سے نفع وضرر کی توقع اور خوف رکھتا ہے، وہ ماسوا اللہ سے کٹ کر صرف اللہ سے رشتہ جوڑلیتا ہے۔ حق تعالیٰ کی معبودیت اور ربوبیت پر یہ یقین بالآخر ایک ایسی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے جو سوائے اللہ کے کائنات کی کسی قوت کے سامنے سر نہیں جھکاتی، اس چیز کو علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ "احساسِ خودی، عرفانِ نفس اور خودشناسی ہی انسان کی تولید وتخلیق کا اصل منشاء ہے، اور خودی ہی اصل زندگی ہے" گویا انسان کی تخلیق کا مقصد ہی عرفانِ نفس یا احساسِ خودی اور اس کی منزلِ مقصود خودی یا عرفانِ نفس کا حصول اور اس کا استحکام ہے جس کے لئے انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی تمام ترقوتوں کو نشوونما دے اور اپنی شخصیّت کی تکمیل کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہے۔ جس شخص کو عرفان نفس حاصل ہوجائے یا دوسرے لفظوں میں وہ خودی کو پالے اور نفسِ مطمئنہ کے درجے پر فائز ہوجائے اس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں شامل فرمالیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ نفسِ امارہ پر قابو پاکر نفس مطمئنہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، وہی لوگ حقیقی معنی میں اللہ کے بندے ہیں اور ان ہی کے لئے جنت کی خوشخبری ہے۔

نفس امّارہ کے داؤ پیچ سے بچنے اور نفسِ مطمئنہ کے درجے تک پہنچنے کیلئے یہ بات بنیادی اہمیّت کی حامل ہے کہ بندے کو اس امر کا دلی اعتراف اور عین الیقین حاصل ہو کہ اس کو مرنے کے بعد اللہ کے روبرو جانا ہے اور اپنے تمام اعمال وافعال کے لئے اس کے سامنے جوابدہ ہونا ہے اور اس کو یہ حقیقت اپنے پیشِ نظر رکھنی ہے کہ "من عمل صالحاً فلنفسه ومن اساء فعلیھا" کہ جس نے عمل صالح کیا تو اس کا فائدہ اس کے نفس کیلئے اس کی ذات کیلئے ہے اور جس نے برا کیا تو اسکی برائی خود اسی پر پڑے گی۔

اللہ کے سامنے جوابدہی کے اس تصور اور اس کے نتیجے کے بارے میں قرآن حکیم بشارت دیتا ہے۔ "واما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوی فان الجنة هی الماوی" کہ جو اس بات کا خیال کرکے ڈرا کہ مجھے اللہ کے سامنے حساب کے لئے

کھڑا ہوتا ہے اور اسی ڈر سے اپنے نفس کی خواہش پر نہ چلا، بلکہ اسے روک کر اپنے قابو میں رکھا اور احکام الٰہی کے تابع بنایا، تو اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔

عرفان نفس دراصل انسان کے روحانی عروج اور ذاتی ارتقار کا نام ہے جس کا مقصد عمل اور تزکیہ نفس ہے، کہ یہی حیات انسانی کا کمال ہے۔

صوفیار نے عرفان نفس کے تین مراحل یا درجے بیان کئے ہیں۔ پہلا درجہ اطاعت کا ہے۔ اس میں دینی فرائض کی پابندی کے ساتھ ادائیگی شامل ہے۔ مثلاً روزہ، حج زکواۃ۔ دوسرا درجہ ضبط نفس ہے کہ انسان کو اپنے نفس پر اتنا قابو حاصل ہو جائے کہ وہ اپنے نفس کو کسی بُرے فعل کے ارتکاب سے روک سکے۔ اس مرحلے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی داخل ہے، اس کا ابتدائی درجہ حرام اور ممنوع چیزوں سے اجتناب اور انتہائی درجہ مکروہات اور مشتبہات سے دور رہنا ہے۔ اور عرفان نفس کا تیسرا درجہ نیابت الٰہی ہے کہ انسان کو یہ عرفان حاصل ہو جائے کہ وہ خدا کا نائب ہے اور اس کو اپنی تمام تر زندگی اللہ کے نائب کی حیثیت سے معروفات کے پھیلانے اور منکرات کے روکنے میں صرف کرنی ہے۔

عرفانِ نفس کی بدولت بالآخر انسان معرفتِ کردگار کا اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے اور وہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بن کر اپنی زندگی اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارنے لگتا ہے۔ جس کو قرآنی الفاظ میں "ان صلواتی ونسکی محیای ومماتی للہ رب العالمین" کہا گیا ہے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔

عزم و استقلال

"عزم" کے معنی پختہ ارادے اور "استقلال" کے معنی قائم رہنے کے ہیں۔ یعنی ایسا پختہ ارادہ جس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا جائے۔

عزم و استقلال انسان کی دو اہم اخلاقی صفات ہیں۔ ان صفات کا تقاضہ ہے کہ پہلے معاملے کی اچھی طرح چھان بین کر لی جائے۔ اس کے ہر پہلو پر مناسب حد تک غور و خوض کر لینے کے بعد اس معاملے سے متعلق کوئی فیصلہ کر لیا جائے اور پھر اس فیصلے پر قائم رہا جائے۔

تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ عزم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "مشاورۃ اہل الرائے و اتباعہم" یعنی اہل الرائے اصحاب سے مشورہ اور پھر اس کا اتباع۔ مراد یہ ہے کہ اپنی اپنی رائے مت اختیار کرو بلکہ اہل الرائے افراد سے مشورہ کر کے ان کی متفقہ رائے پر عمل کرو، یہی عزم ہے۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے "فاذا عزمت فتوکل علی اللہ" (آل عمران، آیت ۱۵۹) یعنی جب تم کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کر لو تو پھر اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ہر کام کی ابتداء سوچ اور غور و فکر سے ہوتی ہے لیکن جب سوچ اور غور و فکر کی منزل گزر جائے اور عمل کی حد شروع ہو جائے تو پھر عمل ہی کرنا چاہیئے۔ اسی لئے اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب تم سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کر لو تو اللہ کے بھروسے پر اسے عملی جامہ پہنانے کیلئے پوری سعی کرو۔

اللہ تعالٰی نے اپنے بندوں پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اس دنیا میں جس کو عالم اسباب کہا گیا ہے، اسباب و ذرائع تلاش کریں۔ اسباب و ذرائع کے استعمال کے طریقے معلوم کریں اور پھر ان اسباب و ذرائع کو عمل میں لائیں لیکن سب کچھ اسباب و ذرائع ہی کو نہ جانیں۔ اصل قوت یا تاثیر اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ چاہے گا تو ان اسباب و ذرائع کو ہمارے لئے مفید و مؤثر بنا دے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو کچھ تم سے بن سکے کر گزرو اور پھر اللہ پر توکل یعنی بھروسہ کرو۔ جو شخص ایک نیک مقصد کے حصول کے لئے کمربستہ ہوتا ہے اس نیک مقصد کے حصول کے لئے مناسب و جائز اسباب و ذرائع فراہم کرتا ہے اور پھر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے وہ بالآخر کامیاب و کامران ہوتا ہے، کیونکہ اس نے اللہ کی مدد کو اپنی قوتِ بازو کے ساتھ شامل کر لیا۔ اور جس کے ساتھ اللہ کی مدد و نصرت ہو جائے اسے دنیا کی کوئی طاقت نیچا نہیں دکھا سکتی۔

اللہ تعالٰی سورۂ محمد میں ارشاد فرماتا ہے "فاذا عزم الامر فلو صدقوا اللّٰہ لکان خیراً لھم"۔ پھر جب کسی معاملے میں عزم یعنی پختہ ارادہ ہو۔ پس اگر وہ سچے رہیں اللہ سے تو ان کا بھلا ہے۔" یعنی عزم کے ساتھ اللہ کے ساتھ بھی معاملہ درست رکھنا چاہیئے" جب ہی اللہ کی نصرت و حمایت افراد کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہمیں صبر و استقلال کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہیئے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے" واصبر علی ما اصابک ان ذلک من عزم الامور۔ کہ جو مصیبت بھی تم پر آئے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ صبر و استقامت بڑے امور میں سے ہے۔ یعنی دنیا میں جو سختیاں پیش آئیں ان کو تحمل اور اولوالعزمی سے برداشت کرنا چاہیئے۔ شدائد سے گھبرا کر ہمت ہار دینا، حوصلہ مندوں کا کام نہیں۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" ان تستقیموا تفلحوا" اگر تم ثابت قدم رہے تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ سورۃ الاحقاف میں ارشاد فرمایا گیا ہے" فاصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل"۔ کہ اسی طرح صبر و استقامت سے کام لو۔ جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر و استقامت سے کام لیا ہے۔

مسلمانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزم وہمت سے بھرپور حیاتِ طیبہ سدا روشن رہنے والی ایک ایسی قندیل ہے جس کی روشنی زندگی کے راستے میں ہمیشہ مشعل کا کام دیتی رہے گی اور ہماری تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ عزم واستقلال سے کام لیکر باہمت لوگوں نے حالات کے رخ کو موڑ دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہہ، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کے استقلال اور عزم سے بھرپور کارنامے ہماری بہترین میراث ہیں۔ اس برصغیر کے مسلمان بادشاہوں اور سپہ سالاروں کا عزم واستقلال بھی تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے اور خود قیامِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے آہنی عزم ویقین اور برصغیر کے مسلمانوں کے عزم واستقلال کا ایک جیتا جاگتا کرشمہ ہے۔ جو قومیں مشکل حالات میں عزم واستقلال کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہتی ہیں، دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ بالآخر فتح وکامرانی ان کے مقدر کا ستارہ بن کر چمکتی ہے۔

فضائلِ رمضانؑ

ماہِ رمضان بے شمار برکتوں اور سعادتوں کا مہینہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ رمضان کیا چیز ہے تو میری امت یہ تمنا کرے کہ سارا سال رمضان ہی ہو جائے۔" اس ماہ کی سب سے بڑی فضیلت اور خصوصیت یہ ہے کہ اس مبارک مہینے میں قرآن کریم نازل کیا گیا جو سب لوگوں کے لئے رہنما ہے، جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں۔ وہ قرآن حق اور باطل کو الگ کرنے والا ہے:-

شھر رمضان الّذی اُنزل فِیہ القرآنُ ھدیً للنّاس وبیّنٰت من الھدیٰ والفُرقان۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے کہ "روزۂ رمضان ایک ایسی خاص عبادت ہے کہ جس پر ساری امت کا اس مخصوص ماہ رمضان میں جمع ہونا اس عبادت کے عمل پر ہمت پیدا کرنے اور اسکے آسان ہونے کا سبب ہے، فضا خیر و برکت سے معمور ہو جاتی ہے اور اس اجتماع سے ہر خاص و عام پر برکتیں نازل ہوتی ہیں اور ہر روزہ دار استعداد اطاعت الہیٰ سے قریب اور گناہوں سے دور ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب روئے زمین پر بسنے والے سارے اہلِ ایمان طاعت الہیٰ میں اس درجہ منہمک ہو جائیں کہ ان کے دن روزے اور راتیں عبادت میں گزریں تو ماحول میں نورانیت پیدا ہو جائے گی۔ اس ماہ کا ادنیٰ حق یہ ہے کہ پورے ماہ

کے روزے رکھے جائیں اور نماز پنجگانہ باجماعت کا اہتمام کیا جائے اور اعلیٰ حق یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھنا، نماز پنجگانہ کی پابندی کرتے ہوئے نماز تراویح کا اہتمام اور رمضان شریف کی راتوں میں عبادت کرنا اور تمام اعضاء اور زبان کو بری باتوں سے روکنا اور رمضان شریف کے آخیر عشرہ میں اعتکاف کرنا ہے۔

رمضان المبارک کی فضیلت کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ میں ہم لوگوں کو وعظ فرمایا کہ "تمہارے اوپر ایک مہینہ آرہا ہے، جو بہت بڑا مہینہ ہے، اس میں ایک رات ہے شبِ قدر جو ہزاروں مہینوں سے بڑھ کر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مبارک مہینے کے روزوں کو فرض فرمایا اور اس کی راتوں کے قیام کو ثواب کی چیز بنایا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں کسی نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے وہ ایسا ہے جیسا کہ غیر رمضان میں فرض ادا کیا اور جو شخص اس مہینے میں کسی فرض کو ادا کرے وہ ایسا ہے۔ جیسا کہ غیر رمضان میں ستّر فرض ادا کرے۔ یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے، اور یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غم خواری کرنے کا ہے۔ اس مہینے میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جو شخص کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے اس کے لئے گناہوں کا کفارہ اور آگ سے خلاصی کا سبب ہو گا اور روزہ دار کے ثواب کی مانند اس کو ثواب ہو گا مگر اس روزہ دار کے ثواب میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص اتنی وسعت نہ رکھے کہ روزہ دار کو روزہ افطار کرائے؟ آپ نے فرمایا۔ پیٹ بھر کر کھلانے پر موقوف نہیں کہ ثواب تو اللہ جل شانہ ایک کھجور سے کوئی افطار کرا دے یا ایک گھونٹ پانی پلا دے یا ایک گھونٹ لسی پلا دے اس پر بھی مرحمت فرما دیتے ہیں۔ یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا اوّل حصہ اللہ کی رحمت اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ نار جہنم سے نجات ہے، جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے بوجھ کو ہلکا کر دے، حق

تعالیٰ جل شانہ اس کی مغفرت فرماتے ہیں اور نار جہنم سے آزادی عطا فرماتے ہیں "
اور فرمایا کہ چار چیزوں کی اس ماہ میں کثرت رکھا کرو جن میں سے دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے واسطے ہیں۔ اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے تمہیں چارہ کار نہیں۔ پہلی دو چیزیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کرو وہ کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت ہے اور دوسری دو چیزیں یہ ہیں کہ جنت کی طلب کرو اور آگ سے پناہ مانگو" اس ماہِ مبارک کو کلام الٰہی کے ساتھ خاص نسبت ہے۔ اسی وجہ سے عموماً اللہ جل شانہ کی تمام کتابیں اس ماہ میں نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ قرآنِ پاک لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر تمام کا تمام اسی مبارک ماہ میں نازل ہوا اور وہاں سے حسبِ موقعہ تھوڑا تھوڑا ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا۔
حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحیفے اسی ماہ کی پہلی یا تیسری تاریخ کو عطا ہوتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور رمضان المبارک کی ۱۲ یا ۱۸ تاریخ کو ملی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت ۶ رمضان المبارک کو عطا ہوئیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل مقدس ۱۲ یا ۱۳ تاریخ کو ملی۔ لہٰذا اس مہینے میں تلاوت قرآن پاک کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے کیونکہ اس ماہ کو قرآن مجید کے ساتھ خاص نسبت ہے۔
حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کے قریب ارشاد فرمایا کہ رمضان کا مہینہ آگیا ہے جو بڑی برکت والا ہے۔ حق تعالیٰ جل شانہ اس ماہ میں تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنی رحمت خاصہ نازل فرماتے ہیں، دعا قبول کرتے ہیں۔ نیکی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش کو دیکھتے ہیں اور ملائکہ سے فخر کرتے ہیں پس اللہ کو اپنی نیکی دکھاؤ۔ بد نصیب ہے وہ شخص جو اس مہینے میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جاتے" حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کو روزے کے ثمرات میں بجز بھوکا رہنے کے

کچھ بھی حاصل نہیں۔ اور بہت سے شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو رات کے جاگ
کی مشقت کے سوا کچھ بھی نہ ملا"

علماء نے لکھا ہے کہ جو شخص دن بھر روزہ رکھ کر مال حرام سے روزہ اف
کرتا ہے اس کو جتنا ثواب روزہ کا ہوا تھا اس سے زیادہ گناہ حرام مال کھانے
گیا۔ اور اس کو سوائے دن بھر بھوکا رہنے کے کچھ نہ ملا۔ یہ کہ روزہ رکھا ہے مگر غ
میں مبتلا رہتا ہے یا یہ کہ روزہ کی حالت میں گناہوں سے نہیں بچتا۔ یا یہ کہ رات
جاگتا ہے مگر ریاء اور شہرت کے لئے جاگتا — اس لئے روزہ دار کو چاہیئے کہ
شریف کی عبادت میں مکمل اخلاص ہو تاکہ اس کی برکات سے محروم نہ رہ جا

ایک بات تجربہ اور مشاہدہ کی یہ ہے کہ جب رمضان المبارک آتا ہے
ابتداء میں عبادت میں خاصا جوش اور سرگرمی ہوتی ہے، بیچ میں پھر سستی
کاہلی یا بے توجہی پیدا ہو جاتی ہے، اور آخر میں پھر کچھ توجہ ہوتی ہے اور جب
رمضان المبارک رخصت ہونے لگتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اس مہ
مہینے کی قدر نہ کی اور اس کا کچھ بھی حق ادا نہ ہوا۔ پھر سوچتے ہیں کہ اگر زندہ ر
اور ہماری زندگی میں رمضان آیا تو آئندہ رمضان میں خوب عبادت کریں گے۔ آئند
شریف آجاتا ہے مگر وہی غفلت طاری رہتی ہے کاش! ہمیں اپنے اعمال
محاسبہ کرنے کا موقع ملے تو رمضان المبارک کی صحیح قدر و قیمت کا احساس
اور اس کی برکات و فیوض کا ادراک حاصل ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو ماہ رمضان کی برکات سے نفع اٹھانے
توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

فضیلتِ شب قدر

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے
نزولِ قرآن کی مبارک راتیں دو ہیں۔ ایک وہ رات ہے کہ جب قرآن پاک سب
سب لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نازل کیا گیا اور دوسری وہ ہے جبکہ قرآن
ے آسمان دنیا سے آنحضرت پر نازل ہونا شروع ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے مزید لکھا ہے کہ جس رات کو قرآن پاک لوح محفوظ سے
مان دنیا پر نازل ہوا وہ وہی رات تھی جب رمضان المبارک میں آنحضرتؐ پر قرآن
ی نازل ہوا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ جس رات کو قرآنِ پاک
ح محفوظ سے آسمان اول پر سب ایک ساتھ بھیجا گیا وہ رمضان المبارک کی ۲۴ ویں
ب تھی۔ اس رات کو قرآن لیلۃ المبارکۃ کہتا ہے۔ دوسری رات وہ ہے جس کو
نِ پاک "لیلۃ القدر" کہتا ہے۔ یہ وہ رات ہے جس میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ
سلام پر قرآن پاک کے نزول کی ابتدا ہوئی۔ پھر تدریج ۲۳ سال تک مناسب
ال آپ پر تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔

بالفاظ دیگر لیلۃ المبارکۃ میں قرآن پاک آسمان اول پر نازل ہوا اور لیلۃ القدر
، قرآن پاک آسمان دنیا سے آنحضرتؐ پر نازل ہونا شروع ہوگیا۔ پہلی رات کے
ے میں " فیھا یفرق کل امر حکیم" ارشاد فرمایا گیا کہ اس رات میں تمام امور
ت تقسیم کئے گئے اور دوسری رات کے بارے میں ارشاد ہوا کہ آنحضرتؐ پر نزول

قرآن کی برکت کے سبب اس کی عبادات کو ایک ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل قرار دیا گیا۔ دوسری خصوصیت یا فضیلت اس رات کو یہ بخشی گئی کہ ملائکہ روح القدس اس رات زمین پر اترتے ہیں۔ اور اس رات کو باطنی حیات اور روحانی خیر و برکت کا ایک خاص نزول ہوتا ہے۔ اس رات جو مسلمان عبادتوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ ان کے انوار کا سایہ ایک دوسرے پر پڑتا ہے۔ ان کی عبادتیں اور دعائیں بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازی جاتی ہیں۔

اس رات کی سب سے بڑی شہادت خود قرآن عظیم ہے۔ قرآن شعائر اللہ میں ہے۔ جسطرح لوگوں میں بادشاہوں کی طرف سے رعایا کی طرف فرامین بھیجنا رائج ہے اور بادشاہوں کی تعظیم کے تحت فرامین شاہی کی تعظیم ہوتی ہے۔ اسی طرح احکم الحاکمین کی طرف سے ساری انسانیت کیلئے یہ ایک ابدی پیغام ہدایت ہے۔ جسکی تعظیم اس کا مطلوب ہے کہ بغیر وضو کے اسکو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اسکے اوامر کی تعمیل کریں۔ اسکے نواہی کے ارتکاب سے باز رہیں۔ خوش بیانی کے ساتھ تلاوت کریں۔ جہاں سجدۂ تلاوت کا حکم دیا گیا ہے وہاں سجدہ تلاوت کریں، جہاں تسبیح کا حکم دیا گیا ہے وہاں تسبیح کریں۔ گویا یہ قرآن کی تعظیم کی رات ہے اور اسکی تعظیم جہاں ہم تلاوت کر کے کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ ہم اس مبارک رات میں اپنے عہد کی تجدید کریں کہ ہم قرآن کے اوامر اور پر چلیں گے اور نواہی سے بچیں گے۔

اس رات کی دوسری فضیلت ملائکہ مقربین کا زمین کی طرف آنا ہے۔ حضرت انس رضی سے بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ لیلۃ القدر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے گروہ کے ساتھ آتے ہیں اور جس کسی کو عبادت میں مشغول دیکھتے ہیں اس کے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں۔ دعائے رحمت اور سلامتی لازم و ملزوم ہیں۔ انہی کو قرآن سلام کہتا ہے۔ یعنی یہ رات امن و چین کی اور دل جمعی کی رات ہے۔ اس میں اللہ والے عجیب و غریب طمانیت محسوس کرتے ہیں اور یہ اثر ہوتا ہے نزول رحمت کا جو ملائکہ اور روح القدس

کی دعا کی برکت سے ظہور میں آتا ہے۔

غرض ان وجوہ سے رمضان المبارک کے مہینہ کی فضیلت تمام مہینوں پر اور شب قدر کی فضیلت تمام راتوں پر ثابت ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ اس کی مناسبت اور خصوصیت ظاہر و باہر ہے۔ لہٰذا قرآن کی خدمت اس ماہ میں خوب کرنی چاہیے۔

فلاحی ریاست کا اسلامی تصوّر

عمرانی علوم کے ماہرین اب اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ ریاست کا مقصد ملک میں محض امن و امان اور نظم و ضبط قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملے اور اندرونی بدنظمی سے بچانا ہی نہیں بلکہ اس کے اعلیٰ مقاصد میں اجتماعی عدل اور سماجی فلاح بھی داخل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کو صحیح معنی میں فلاحی اور خادم خلق ہونا چاہیے۔

اسلام اپنی ابتدا ہی سے ریاست کے فلاحی ہونے کو نہ صرف نظریاتی طور پر تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کے لئے عملی بنیادیں بھی فراہم کرتا ہے اور پہلی صدی ہجری میں خلافت راشدہ اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا دورِ خلافت فلاحی ریاست کے اسلامی تصور کی عملی تصویر پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔

اسلام میں ریاست کے فلاحی تصور کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہے اور انسان اس روئے زمین پہ اللہ کے احکام و قوانین کی تنفیذ کے لئے اللہ کا خلیفہ ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ ریاست کو نظریاتی طور پر اللہ کے دین کی بنیادوں پر قائم کرے اور اس کا پورا ڈھانچہ اسلامی اصولوں اور بنیادوں پر استوار ہو۔ کیونکہ اگر ریاست کا وجود اسلامی اقدار پر مبنی ہوگا تو لازمی بات ہے کہ فلاح کا تصور بھی انہیں اقدار سے ابھرے گا اور یہ تصورِ الہامی ہدایات کے تابع ہوگا۔ محض عقل معاشرہ کی فلاح کی ضامن نہیں ہو سکتی کیونکہ وقتی مصلحتیں ان عقلی ترکتازیوں کے ذریعہ انسانی فلاح کے

پیمانے کو ہر دم بدلتی رہیں گی۔
انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح کا اسلامی تصور" ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرۃ حسنة "یعنی دنیا اور آخرت دونوں کی یکساں بھلائی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہے بلکہ وہ دنیاوی بھلائی اور فلاح کو بھی آخرت کی بھلائی کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر فلاحی ریاست کا اسلامی تصور بنیادی طور پر ایک فلاحی ریاست کو اس امر کا پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی نہ صرف جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہے بلکہ اس کے عقائد، عبادات اور اخلاق و عبادات اور مادی و روحانی ارتقار کی صورت گری کا فریضہ بھی ریاست (STATE) کے ذمہ ہے۔ مثال کے طور پر ریاست اگر کوئی ایسا قانون بناتی ہے یا کوئی ایسی شئے ایجاد کرتی ہے اور اسے اس طرح رواج دیتی ہے کہ وہ اس کے شہریوں کی اخلاقی حالت کو تباہ کرنے کا موجب ہے یا ان میں دین سے بے زاری یا دین کے خلاف جذبات پیدا کرتی ہے تو وہ ریاست دیگر فلاحی کام کیوں نہ کر رہی ہو، فلاحی ریاست کے اسلامی تصور پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتی یا مثال کے طور پر ایک ایسے نظامِ تعلیم کو رواج دیتی ہے جو لادینی ہو تو ریاست اگرچہ زندگی کے بعض دوسرے دائروں میں بعض امور کیوں نہ انجام دے رہی ہو، فلاحی ریاست کے اسلامی تصور کی ہرگز نمائندگی نہیں کرتی۔
دوسرے لفظوں میں ایک فلاحی ریاست جب ہی اسلامی فلاحی ریاست کہلانے کی مستحق ہو گی جبکہ ریاست کی اجتماعی قوت اسلام کے تابع ہو۔ وہ ریاست کے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کی صورت گری اسلامی تقاضوں کے موجب کرتی ہو۔ یہ نہیں تو محض ریاست کا مذہب اسلام قرار دے کر مسلمان کی زندگی کے علمی و عملی، معاشی و اقتصادی، قومی و بین الاقوامی دائروں میں اسلام کے اصولوں کو جاری و ساری کرنے میں صرف اپنے آئینی تعلق کا اظہار کرنا ہرگز کافی نہیں۔ اسلامی ریاست کا فلاحی تصور نظم حکومت، دیوانی و فوجداری قانون،

ضابطۂ اخلاق و اعمال اور نظام تعلقات خارجہ سب پر حاوی ہے کیونکہ ریاست کا سب سے بڑا کام انسانیت کی فلاح ہے جو مذہب اسلام کی اصلاحی حکمت عملی کے تحت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ روش دنیا اور آخرت دونوں ہی میں موجب رسوائی و عتاب الہٰی ہے کہ دین کے بعض حصوں کو تو اختیار کر لیا جائے اور بعض حصوں کو ترک کر دیا جائے اس لئے کہ وہ ہماری خواہش نفس کے مطابق نہیں ہیں۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔

اے مسلمانو! دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

اور اہل کتاب کی طرح نہیں تم کتاب الہٰی کے بعض حصوں کو تو مانتے ہو اور بعض حصوں کا انکار کرتے ہو۔

اس روش کا نتیجہ ہلاکت خیز تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب۔

پھر تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کا بدلہ دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و رسوائی کے اور کیا ہو سکتا ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور کے بارے میں اس بنیادی بات کے عرض کرنے کے بعد اس کی دوسری جزئیات پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا درجہ عدل و انصاف کا ہے۔ فلاحی ریاست کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ کتاب الہٰی اور سنت نبوی کی روشنی میں لوگوں کے درمیان بلا امتیاز رنگ و نسل اور زبان و خطہ انصاف سے کام لے اور اپنی جابرانہ قوت کے

ذریعہ از خود کسی کی حق تلفی نہ کرے، خواہ حق تلفی مالی ہو یا بدنی اور نہ کسی کو کسی کی حق تلفی کرنے دے۔ یہ تصور سراسر اسلام کے منافی ہے کہ ایک اہل شخص پر اعلیٰ تعلیم یا معاش کا دروازہ اس لئے بند کر دیا جائے کہ وہ کسی خاص جگہ کا رہنے والا ہے۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور میں ہر ریاست کے ذمہ یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات کی نہ صرف ضمانت دے بلکہ اپنی تمام ترقوتیں ان کی فراہمی کے لئے وقف کر دے جو انسان کو ضرورت اور احتیاج سے نجات دلانے کا سبب ہوں۔ ان کے لئے روزگار اور ترقی کے مواقع یکساں طور پر موجود اور عام ہوں۔ فلاحی ریاست کا اسلامی تصور زندگی میں انفرادی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور محنت اور کسب حلال کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ اسلام ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کی مذمت کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی معاشرہ کے ضرورت مند اور محتاج و نادار اور معذور لوگوں کی کفالت کو ریاست کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص مقروض ہو کر مر جائے اور اس نے ترکہ نہ چھوڑا ہو کہ جس سے اس کا قرضہ ادا کیا جا سکے تو یہ ریاست کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے قرضہ ادا کرے، منجملہ دیگر مقاصد کے، اس مقصد کیلئے زکواۃ کا نظام قائم کیا گیا اور یہ اصول بنایا گیا کہ صاحب استطاعت افراد کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والوں کے لئے اور رزق سے محروم رہ جانے والوں کے لئے، (و فی اموالھم حقٌ للسائل والمحروم) چنانچہ اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ معاشرہ کے صاحب استطاعت سے زکواۃ حاصل کرے اور اس کو ان حقداران تک پہنچائے جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے ـــــ ساتھ ہی اسلامی حکومت پر یہ بھی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی حدود مملکت میں غیر شرعی ٹیکس نہ لگائے۔ نہ صرف یہ بلکہ ناجائز ذرائع آمدنی خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، سرکاری ہوں یا غیر سرکاری

ان کو بھی ختم کر دے۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کی تعلیم کا مناسب بندوبست کرے۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ میں ساری دنیا کے لئے معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تعلیم کے نظام میں اوّلین اہمیت دینی علوم کو دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان تمام علوم کی تدریس بھی شامل ہے جو دفاع دین اور بقائے جہان کے لئے ضروری ہیں۔ یہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ اسلام کے ہر اچھے اور برے دور میں تعلیم بالکل مفت رہی اور اس کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے رہے ہیں۔

فلاحی ریاست کے اسلامی تصور میں مفت علاج کی سہولت بھی داخل ہے۔ یہ امر ایک فلاحی ریاست کے لئے نہایت اہم ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی اخلاقی و روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی طرف بھی توجہ دے۔ کیونکہ بیمار جسم بیمار ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں علاج کی تمام تر سہولتوں کا بلا معاوضہ اور بالکل مفت ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اور سب سے آخر میں اسلامی ریاست کے حکمران کے احساس ذمہ داری اور فلاحی ریاست کے اسلامی تصور کی بہترین ترجمانی کے لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اگر دجلہ کے اس پار کوئی اونٹ غذا اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا تو عمر (رضی اللہ عنہ) روزِ جزا خدا کو کیا جواب دے گا؟"

فلسفۂ معراج

جو لوگ عقلیت محض کا شکار ہیں، وہ آنحضرت کی روحانی و جسمانی معراج کے واقعہ کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر اللہ کا ایک بندہ راتوں رات از فرش تا بہ عرش تمام منازل طے کر کے قرب الٰہی کے شرف سے بہرہ ور ہو سکتا ہے؟

لیکن آج کی سائنسی تحقیقات نے بہت سی ان باتوں کو سچ کر دکھایا، جن کو کچھ عرصے پہلے تک مجذوب کی بڑ سمجھا جاتا رہا۔ کیا انسان کا چاند تک پہنچ جانا ایک ایسی حقیقت نہیں جس کا علم ساری دنیا کو ہے۔ کیا ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ دنیا کے ایک حصے میں رہنے والے انسانوں کی آوازیں اور تصاویر دنیا کے دوسرے حصے کے رہنے والوں تک چند لمحوں میں نہیں پہنچ جاتیں؟ —— کیا آج آواز سے زیادہ تیز رفتار طیارے نہیں ہیں جو چند گھنٹوں میں دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پہنچ جاتے ہیں؟ ہم سب ان باتوں کا یقین کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ اس وقت اس تحریر کو پڑھ رہے ہیں۔ یہ یقین ہمیں علم اور مشاہدے کی بنا پر حاصل ہوا ہے۔ لیکن کائنات ارضی و سماوی کا علم بسیط ہے اور ہمارا علم مشاہدہ اور تجربے کی پیداوار ہونے کے سبب ایک دائرہ میں محیط ہے۔ علم انسانی کی حدیں محدود ہیں۔ اس کی معلومات کے دائرے تنگ اور مختصر ہیں۔ درحقیقت وحی کی ضرورت ہی وہاں ہوتی ہے جہاں ادراک کی سرحدیں ختم اور انسانی عقل درماندہ اور سرگرداں نظر آتی ہے، جب ہی علم الٰہی انسانوں تک رسولوں کے ذریعہ پہنچتا ہے۔

اور وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔

معراج کا واقعہ تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ محیر العقول واقعات میں سے ہے، جس کی نظیر موجود نہیں۔ خود الفاظ قرآنی "سبحان الذی اسریٰ بعبدہ" بتا دیتے ہیں۔ کہ یہ ایک بہت بڑا خارق عادت واقعہ ہے جو اللہ کی لا محدود قدرت سے ظہور میں آیا ہے۔ لیکن آج کی سائنسی تحقیقات نے اس واقعہ کی صحت کو دوبالا کر دیا ہے کہ جب ایک انسان خالق کے عطا کردہ دماغ سے کام لیکر اور آلات ایجاد کر کے زمین سے لاکھوں میل اونچائی پر پہنچ سکتا ہے تو کیا اس انسان کا خالق اپنی قدرت کاملہ کے ایک ادنیٰ اظہار کے طور پر اپنے محبوب بندے کو راتوں رات کروڑوں میل کی مسافت طے کرا کر آسمانوں کی سیر نہیں کرا سکتا؟ نظام شمس و قمر کا مالک، کیا زمان و مکان کا خالق، وقت کی گردش وقت کی رفتار کو روک نہیں سکتا؟ بیشک وہ خالق حقیقی اور ساری کائنات کا مالک اصلی ہر چیز پر قادر ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ دراصل ہمیں علم کا تھوڑا ہی سا حصہ عطا ہوا ہے۔

واقعہ معراج کا فلسفہ اور اس کی فکری بنیاد کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص احمد مجتبیٰ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ شرف و بزرگی عطا فرمائی جو کسی اور نبی کو عطا نہیں کی گئی، بلکہ تمام انبیاء پر آپ کی فضیلت و امامت اور شرف و کرامت ظاہر کی گئی، جو کسی اور نبی کو عطا نہیں کی گئی۔ آپ کو اپنے قرب و کلام کی اس سعادت سے نوازا گیا۔ جس کی تاب نہ لا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر گر پڑے تھے۔ آپ پر اس انعام و اکرام کی بارش کی گئی جس کا آپ سے پہلے کوئی نبی تصور بھی نہ کر سکتا تھا، لیکن آپ کی شان کریمی ملاحظہ ہو۔ کہ اس وقت بھی آپ اپنے اُمتیوں کو نہیں بھولے اور آپ نے اپنے رب سے اپنے اُمتیوں کی مغفرت کے پروانے حاصل کئے اور آپکے قدوم و آثار کی برکت سے آپ کی امت پر پل صراط کی راہ آسان کر دی گئی۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معراج ایک شانِ عظیم ہونے کے ساتھ انسانوں

کے لئے ایک امتحان بھی ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے ۔

"وما جعلنا الرویا التی ارینٰک الا فتنۃ للناس"

کہ ہم نے جو دیدار تجھے دکھلایا اسے انسانوں کے لئے امتحان کر دیا کہ وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب ۔ چنانچہ وہ لوگ جو صراطِ مستقیم پر ہیں، آپ کی تصدیق کریں گے ۔ اور وہ لوگ جو شیطانی وسوسوں میں مبتلا ہیں ۔ آپ کی تکذیب کریں گے، آپ کو جھٹلائیں گے ۔ اسی لئے حضرت ابوبکرؓ کو صدیق اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ آپ نے سنتے ہی بلا جھجک اس واقعہ کی تصدیق فرمائی ۔ مقام معراج، عروج روح کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا ۔ اس میں شک و شبہ وہی کر سکتا ہے، جسے خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین نہ ہو ۔ اس لئے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ جہاں تک یہ واقعہ معراج ان کی سمجھ میں آئے اس پر شکر کریں اور جہاں سمجھ میں نہ آئے اس کو ایمان کے ساتھ تسلیم کر لیں کہ یہ ہمارے ایمان کی ایک کسوٹی بھی ہے ۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے عجائب و اسرار اس قدر ہیں کہ کوئی ان کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔ اس کی مثال مٹھائی کی سی ہے جس نے چکھی وہ اس کے ذائقے اور مزے سے بخوبی واقف ہو گا لیکن جس نے نہ چکھی ہو اس کے سامنے اس کے ذائقہ اور مزے کی کیفیت لاکھ بیان کی جائے وہ اس مزے اور ذائقہ سے پوری طرح واقف نہ ہو سکے گا، لہٰذا جو نفوس قدسیہ ایمان کی حلاوت سے بہرہ ور ہیں ۔ ان کے لئے اس واقعے پر ایمان لانا ایسا ہی ہے جیسا کہ مٹھائی چکھ کر اس کے ذائقہ کا ادراک، یقین ۔ بعض مشائخ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام تھی ۔ حتیٰ کہ ملائکہ بھی آپ کی امت میں تھے ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو رسول بنا کر اہلِ زمین کی تعلیم کے لئے بھیجا ۔ اور اہلِ آسمان کو یہ عروج بخشا کہ انہوں نے آپ سے آداب سیکھے ۔ جہاں تک کیفیت معراج کا تعلق ہے ۔ اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ معراج جسم و روح دونوں کے ساتھ بحالت بیداری واقع ہوئی ۔ یہ مسئلہ اسلامی عقائد میں داخل ہے اور اس کی حقیقت قطعی ہے ۔ بالفاظ دیگر ایک مسلمان کے لئے واقعہ معراج

جیسا کہ قرآن پاک میں مذکور ہے، دینی عقائد کا جزو ہے۔ اس کا ثبوت خود آیت کریمہ سبحٰن الذی اسرٰی بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من اٰیتنا انہ ھو السمیع البصیر۔ میں ذکر عبد کو لے جانے کا ہے اور "عبد" کا لفظ روح مع جسم دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسی آیت میں واقعہ معراج کی غرض و غایت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندے کو اپنی کچھ آیات یعنی نشانیاں دکھلانا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو آپکے عظیم منصب کی مناسبت سے مادی حجابات ہٹا کر کائنات ارضی و سماوی کی وہ حقیقتیں مشاہدہ کرائیں، جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کئے گئے تھے تاکہ وہ اپنے براست علم اور مشاہدے کی بنا پر اس دنیا کے سارے بسنے والے انسانوں کیلئے بشیر و نذیر کی حیثیت سے اس دنیاوی زندگی کے مقصد اور انجام کار آخرت کی طرف لوٹنے کی راہنمائی کر سکیں اور ساری مخلوق کے سامنے یہ شہادت دے سکیں کہ میری آنکھوں نے وہاں کیا کیا دیکھا تاکہ بُرے لوگ عذاب آخرت سے ڈریں اور نیک لوگ جنت کی بشارت سن لیں۔

اس مبارک شب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امتِ مسلمہ پر نماز فرض کی گئی۔ نماز جو دینِ اسلام کا ستون اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے الفاظ میں "شعائر اللہ" میں سے ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کے لئے نماز کی فرضیت کے ذریعہ وہ صورت اور کیفیت مقرر فرمائی جو قربِ الٰہی کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی صورتِ قیام صلوٰۃ بہت محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اس وقت مقدس تجلیات کا نزول ہوتا ہے اور نماز پڑھنے والا اپنے نفس پر غالب آکر عبدیت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا انعام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ معراج کے موقعہ پر ان کے امتیوں کو ملا کہ اس حالتِ نماز میں اللہ کی عظمت اور

اپنی عاجزی کے اظہار کے طریقوں کو جان لیا۔ اور ان کے پاک نفسوں کو روحانی تسکین حاصل کرنے کا ایک تریاق ہاتھ آیا۔ نماز کو معراج المؤمنین ایمان والوں کی معراج بھی اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کو اُخروی تجلیات کے لئے تیار کرتی ہے اور خدا کی محبت اور رحمت کا بڑا سبب ہے، اور مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ایک ایسی علامت اور نشانی ہے جو مسلمان اور کافر کے درمیان تمیز کرتی ہے۔

قانون کا احترام

قانون اپنے عام اصطلاحی معنی میں " باہمی سلوک اور روابط کے مجموعۂ اقدار" کا نام ہے۔ موجودہ دور میں " انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لئے قواعد وضوابط کے ایسے مجموعہ کا نام قانون ہے جسے حکومت نافذ کرے"

قانون ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اسکے بغیر متمدن انسانی معاشرہ کا تصور ممکن نہیں۔ قانون کے ذریعہ معاشرہ کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ فرائض ادا کئے جاتے ہیں۔ عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں معاشرہ کے افراد جو مختلف پیشوں اور حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں، ایک نظام کے تحت قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے ظلم وستم سے محفوظ رہیں۔

دراصل انسانی زندگی کے تقاضے اس قدر گوناگوں اور اسکی ضروریات اس قدر متنوع ہیں کہ معاشرہ کو ایک مضبوط قانونی نظام پر قائم کئے بغیر ان کی تکمیل نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اگر قانون ابتدائی تعلیم جبری قرار دیتا ہے تو اس لئے کہ معاشرہ جاہل نہ رہے۔ اگر قانون مجرموں کو سزا دیتا ہے تو اس لئے کہ جرائم کا سدِباب ہو اور لوگ امن وسکون کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں اگر قانون ظلم و بے انصافی کے خلاف ہے تو اسلئے کہ کمزور کی حق تلفی نہ ہو۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جبکہ معاشرہ کا ہر فرد اپنے دل میں قانون کا احترام اور اس کی پیروی کا جذبہ رکھتا ہو۔

قانون کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک عمومی اور دوسرا خصوصی عمومی سے میری مراد وہ قوانین ہیں جو کوئی حکومت ملک کے عام نظم ونسق، امن وامان اور معاشرہ کو انتشار اور افراتفری سے محفوظ رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً بناتی ہے۔ ان قوانین میں مالی حقوق کی محافظت اور جرائم کے انسداد سے لیکر سڑک پر چلنے کے قواعد اور مکان کی تعمیر تک کے اصول شامل ہیں اور ان کا اطلاق بلاتخصیص مذہب وملت مملکت کے تمام باشندوں بلکہ غیر ملکیوں پر بھی یکساں طور پر ہوتا ہے۔ مملکت کے نظام کو مساوی اور عادلانہ بنیادوں پر چلانے کیلئے تمام شہریوں بلکہ غیر ملکیوں کے لئے ان سب قوانین اور ہدایات کا احترام ضروری ہے۔ اس میں اسلامی نقطہ نظر سے صرف ایک ہی استثنار ہے، وہ یہ کہ قوانین اور احکام اللہ کی معصیت پر مبنی نہ ہوں۔

"لاطاعة لمخلوق فی معصیه الخالق"

(ترجمہ) مخلوق پر کسی ایسے امر کی اطاعت واجب نہیں جس میں اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی معصیت ہوتی ہو۔

قانون کا خصوصی پہلو، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور اس سے میری مراد قانون شریعت ہے جو کتاب وسنت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اسلامی نقطۂ نظر سے یہی پہلو اس وقت ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

اسلام بنیادی طور پر قانون کی حرمت وبزرگی اور اعزاز کا قائل ہے۔ اور اس کی پیروی پر بڑا زور دیتا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی، اسلام کے نظریہ کے مطابق ایک خاص قسم کے قاعدہ قرینے، نظم وضبط اور آئین وقانون کے تابع ہے، خواہ وہ زندگی کا عبادتی پہلو ہو یا معاملاتی۔ چنانچہ سورۃ النسار کی ۶۴ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاعَ باذن اللّٰہ"

(ترجمہ) کہ ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے۔ اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ اگلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :-

" فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لایجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت

(ترجمہ) یعنی تمہارے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو خوشی سے نہ مان لیں، اس وقت تک مومن نہ ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو قاعدے اور ضابطے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کو جان و دل سے مانیں اور ان پر عمل کریں، ہم تب ہی صحیح معنی میں مومن کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی قانون یا قاعدہ کی حکمت اور بھید ہماری عقل و فہم میں نہ آئے لیکن محض اس بنا پر کہ وہ ہماری عقل و فہم میں نہیں آیا، اس کے ماننے اور پیروی کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سورۃ احزاب کی ۳۶ ویں آیت میں احترام قانون کے بارے میں پھر ارشاد ہوتا ہے۔

" وما کان لمومن ولا مومنةٍ اذا قضی اللّٰہ ورسوله امراً ، ان یکون لهم الخیرةً من امرهم -

(ترجمہ) یعنی کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اب ان مومنوں کو ان کے معاملات میں کوئی اختیار باقی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو امور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے فیصل شدہ ہیں۔ وہ قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں اختلاف یا انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کرے اور ان کی پوری طرح پیروی کرے۔ مثال کے طور پر ماہ رمضان میں اللہ اور اس کے رسول نے روزہ رکھنے کا عام حکم دیا ہے۔ اس پر امت کا اجماع ہے کہ روزہ فرض

ہے اور دین اسلام کا ایک رکن ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں پر فرض ہے کہ عذر شرعی کے بغیر روزہ نہ چھوڑیں۔

اسی طرح زندگی کے عام امور اور معاملات میں بھی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو ہدائتیں بصورت قانون ـــــ فرض یا واجب ـــــ ہم تک پہنچی ہیں۔ ہم پر ان کی پیروی اور اطاعت لازم ہے۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم میں ورثاء کے حصے مقرر ہیں، اگر ہم کسی وارث کو اسکا شرعی حصہ نہیں دیں گے، اور متوفی کے ترکہ کو چھپا جائیں گے یا خورد برد کرلیں گے تو ہم اللہ اور اس کے رسول کے قانون سے روگردانی کے مرتکب ہوں گے اور من یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً۔ کے مصداق اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرکے کھلی گمراہی میں پڑجائیں گے۔

قانونِ شریعت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کا تقدس رکھتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کی جزاء وسزا کا ذکر کرتا ہے۔ ایک عمومی قانون کی خلاف ورزی دُنیا میں سزا کا موجب ہوتی ہے۔ لیکن قانونِ شریعت کی خلاف ورزی، نافرمانی اور بے احترامی دنیا اور آخرت دونوں میں رسوائی اور بدنامی کا موجب ہوگی۔

قرآن و حدیث کا باہمی تعلق

خالق سے اس کی مخلوق کا تعلق براہِ راست انبیاء کرام کو حاصل ہوتا ہے۔ اور انبیاء کے واسطے اور ذریعے سے مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے مخلوق کا نبی کے ساتھ جتنا مضبوط تعلق ہوتا ہے۔ اسی قدر اللہ سے تعلق میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا جو اور جتنا تعلق سنت و حدیث رسولؐ سے ہوگا اتنا اور ویسا ہی تعلق کتاب اللہ سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات جو نبیؐ کے واسطے سے مخلوق تک پہنچتے ہیں۔ ان کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے قرآن پاک کے صاف و صریح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جس میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرض کئے ہوئے احکام کو اپنی کتاب میں محکم یعنی قطعی طور پر بیان کر دیا ہے، مگر ان کی کیفیت کی تشریح اپنے نبی کے الفاظ میں کی ہے۔

تیسری قسم میں وہ احکام آتے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیان کیا، جن کے بارے میں بظاہر اللہ تعالیٰ کا کوئی قرآنی حکم نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے رسول کی اطاعت کو نیز ان کے حکم کے مطابق عمل کرنے کو فرض قرار دیا ہے اور اس حکم کے ذریعہ قرآن اور حدیث کے باہمی تعلق کی بنیاد قائم فرما دی ہے۔ اور چوتھی قسم میں وہ تمام احکام

داخل ہیں۔ جن کا طلب کرنا ہے۔ اجتہاد کے ذریعہ رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین رکھنے والی جماعت کے ذمہ ہے کیونکہ ان اصحاب میں اللہ تعالیٰ نے وہ عقلیں ودیعت رکھی ہیں جو نیک و بد یا خیر و شر اور نور و ظلمت میں ہدایت کر رہی ہیں، اجتہادی احکام قرآن و سنت اور احادیث رسول ہی سے اخذ ہوتے ہیں، جن کو ان کی عقلیں علوم نبوت کی مدد سے معلوم کر لیتی ہیں۔

بہر حال ان چاروں قسم کے احکام و ہدایات کے مخلوق تک پہنچانے میں نبی ہی واسطہ ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ احکام و ہدایات فرشتہ کے ذریعہ الفاظ کی صورت میں نبی تک پہنچا دیتے جاتے ہیں اور کبھی نبی کے دل پر بلا آواز اور الفاظ کے پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ ان چاروں قسموں میں پہلا پیغام وحی متلو یعنی تلاوت کی جانے والی وحی یعنی قرآن ہے اور دوسرا پیغام وحی غیر متلو یا حدیث رسول ہے یعنی وہ جس کی تلاوت نہ کی جاتی ہو۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور حدیث اور سنتِ رسول کتاب اللہ کی قولی و عملی تفسیر ہے جس کے بغیر قرآن کا حقیقی مفہوم حاصل ہی نہیں ہو سکتا، گویا ایک تو قرآن کریم ہے جو اوراق میں ہمارے سامنے ہے اور دوسرا عملی قرآن ہے، جس کو سنت اور حدیث کے نام سے جانتے ہیں۔ گویا قرآنِ حکیم میں اصول اور کلیات ہیں۔ انہی کی تفصیلات آپ کو حدیث اور سنتِ رسول میں ملتی ہیں۔

ایسی صورت میں شریعت اسلام کا سارے کا سارا مدار وحی متلو یعنی کتاب اور نبی کے ارشادات اور آپ کی سیرت پہ ہے جس طرح بہت سے احکام و ہدایات قرآن حکیم میں مذکور ہیں، اسی طرح بہت سے احکام و ہدایات بغیر لفظ کے وحی کی صورت میں نبی پر نازل ہوتے اور شریعت کا جزو قرار پاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جہاں کہیں اطیعوا اللہ کا ذکر ہے وہاں اطیعوا الرسول کا بھی ذکر ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔

قرآنِ صراحت کے ساتھ فرماتا ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ، جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ قرآن مجید کے احکام و ہدایات کے ساتھ ساتھ حدیث و سنت کے واجب ہونے کے سلسلے میں قرآن وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ رسول تمہارے پاس جو کچھ لائے ہیں۔ اس کو اختیار کرو اور اس پر عمل کرو اور جن باتوں سے تمہیں روکیں ان سے باز رہو۔ وما اٰتکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا۔

قرآن حکیم رسول اللہ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ "الکتاب" سے مراد تو کتاب اللہ ظاہر ہے۔ حکمت کے بارے میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد سنتِ رسول ہے اور یہ حکمت یا سنت رسول بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ حکمت کے لئے بھی قرآن حکیم کئی مقامات پر انزل کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

علامہ شوکانی نے اپنی کتاب سنت کی بحث کے تحت امام اوزاعی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ امام اوزاعی نے فرمایا۔ الکتاب احوج الی السنۃ۔ کتاب اللہ کے لئے سنت رسول اللہ کی زیادہ حاجت ہے۔ غرض قرآن کی حیثیت ایک متن کی ہے اور سنت اس کی شرح و بیان۔ قرآن ایک روح ہے اور سنت اس کا قلب۔ حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری کا قول ہے کہ بغیر سنت کے قرآن پر نہ ایمان لانا ممکن ہے اور نہ عمل کرنا۔ اگر آپ حدیث و سنت رسول کو وہ مقام و اہمیت نہ دیں جس کی وہ مستحق ہے تو دین اسلام پر حقیقی معنی میں عمل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم حکم دیتا ہے" اقیموا الصلوۃ" نماز قائم کرو۔ اب یہ بات تو آپ سنت رسول ہی کے ذریعے معلوم کر سکتے ہیں کہ نماز کس طرح درست طریقہ پر ادا کی جائے۔ جو لوگ صرف قرآن کی بات کرتے ہیں کہ ان کیلئے صرف قرآن کافی ہے۔ ذرا وہ قرآن کو سامنے رکھ کر نماز پڑھ کر دکھا دیں یا قرآن کہتا ہے آتوا الزکواۃ۔ زکواۃ ادا کیا کرو۔ اب کتنی زکواۃ ادا کی جائے۔ کتنی

مدت گزرنے پرادا کی جائے، کن کن اموال پردی جاتی ہے ؟ یہ سب باتیں تو آپ سنتِ رسول ہی کے ذریعہ معلوم کرسکتے ہیں ۔ قرآن کہتا ہے :-

" اتموا الحج والعمرة " حج وعمرہ پورا کرو ۔

اب آپ قرآن کے اس حج وعمرہ کے حکم پر کس طرح عمل کریں ؟ یہ عمل تو آپ کو حدیث اور سنتِ رسولؐ ہی بتلائیں گی ۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :-

" ان علینا جمعه و قرآنه " ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا (آپ کے سینہ میں) جمع کروا دینا اور آپ کی زبان سے پڑھوا دینا ۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کا بیان ۔ اور یہ بات تو ایک عام تعلیم یافتہ شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن و بیان دو علیحدہ چیزیں ہیں ۔ قرأت تو الفاظ کا جوں کا توں پڑھ دینا ہے اور بیان کسی چھپی ہوئی یا غیر معلوم بات کو کھول دینے کو کہتے ہیں ، ظاہر ہے کہ یہاں کھول دینے کا مطلب ہے ، قرآن حکیم کے معانی اور مطالب کو بیان کرنا جو قرآن کے الفاظ سن لینے کے بعد بھی پڑھنے والے پر پوشیدہ رہ سکتے ہیں ۔

اس بیان کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں جس طریقہ پر بھی ڈالا گیا ہے ۔ جب حضور اکرمؐ کے سینہ مبارک سے الفاظ کی شکل میں زبان پر آیا تو وہی بیان حدیث نبوی ہے جس کا مضمون اللہ کی طرف سے القا ہوا اور الفاظ اللہ کے رسول کی طرف سے ادا ہوئے ۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ۔ ہم نے اُتارا آپ کی طرف ذکر یعنی قرآن کو ۔ تاکہ آپ لوگوں کے واسطے خوب کھول کھول کر بیان کر دیں ، وہ جو ان کی طرف بھیجا گیا ہے ۔ خود قرآن کی زبان میں آنحضرتؐ کے ارشادات قرآن کی تفسیر و بیان بلکہ آپ کے ارشادات اور ہدایات و احادیث و سنتیں نزول قرآن کی غایت اور مقصد کی تکمیل کا سبب اور ذریعہ ہیں ۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد

فرماتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل و اکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دیا۔ وہ نعمتیں جس کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے قرآن حکیم کے ملنے کے بعد رسول اللہ کی ۲۳ سالہ زندگی ہے جو احادیث و سنن کے ذریعہ اسلام کی تکمیلی شان میں آج تک موجود ہے۔

قناعت

قرآنِ حکیم کے بارے میں بعض حکماءِ اخلاق نے لکھا ہے کہ "قرآنِ حکیم روحانی طب کی کتاب ہے" یعنی اللہ کی یہ کتاب انسان کے اندر سے تبدیلی لاتی ہے اور اسکا تعلق اپنے خالق سے استوار کر کے اس کے نفس کی برائیوں کو مغلوب کر کے اچھائیوں کو غالب کرتی ہے۔ چنانچہ اللہ کی یہ کتاب جہاں ایک طرف اخلاقی رذائل مثلاً حسد، کینہ، بغض، غیبت، تکبر اور بدگوئی وغیرہ سے منع کرتی ہے۔ وہاں دوسری طرف اخلاقی فضائل مثلاً ایثار و احسان باہمی ہمدردی اور تعاون کی تعلیم دیتی ہے۔

~~اکثر علمائے اخلاق نے لکھا ہے~~ دنیا بھر کہ ہماری بہت سی اخلاقی برائیوں کا سبب، مال کی محبت ہے۔ انسان مال کے بے جا حصول کیلئے دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے اور اخلاقی حدوں کو بڑی بیدردی کے ساتھ پھلانگ جاتا ہے اور ذرہ برابر نہیں سوچتا کہ اس کے اس طرزِ فکر و عمل سے انسانی تہذیبی قدریں پامال ہو رہی ہیں، جس کے سبب بالآخر انسان اخلاق کی بلندیوں کو چھونے کے بجائے قعرِ مذلت میں جا گرتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں مال کی اس بے جا محبت کے خلاف سخت تنبیہیں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ سورۃ تکاثر میں ارشاد ہوتا ہے:۔

الھٰکم التکاثر، حتیٰ زرتم المقابر، کلا سوف تعلمون، ثم کلا سوف تعلمون، کلا لو تعلمون علم الیقین، لترون الجحیم، ثم لترونھا عین الیقین

ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم ۔

اس سورت کا خلاصہ یہ ہے کہ مال کی کثرت اور دنیا کے ساز و سامان کی حرص آدمی کو غفلت میں پھنسائے رکھتی ہے نہ خدا ہی یاد آتا ہے اور نہ آخرت کا خیال ۔ بس شب و روز یہی دُھن سوار رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے مال حاصل ہو جائے ۔ غفلت کا یہ پردہ آنکھوں کے سامنے پڑا رہتا ہے ۔ تا آنکہ زندگی کا آخری لمحہ آن پہنچتا ہے اور موت اس کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور بالآخر وہ اس دارِ فانی سے دارِ آخرت کی طرف کوچ کر جاتا ہے ۔ وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں مال کی یہ حرص ایک عذاب بر جان تھی ۔ جس نے اسے منعم حقیقی کی طرف سے غافل کئے رکھا اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل نہ کیا ۔ جس کا نتیجہ دوزخ کی شکل میں آنکھوں کے سامنے آیا ۔

اس مضمون کو سورۃ ہمزۃ میں یوں بیان فرمایا ۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ الذی جمع مالا وعددہ ، یحسب ان مالہ اخلدہ ، کلا لینبذن فی الحطمۃ وما ادراک ما الحطمہ ، نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ ، انھا علیھم مؤصدۃ ، فی عمد ممددۃ ۔

یعنی یہ غافل انسان مارے حرص کے مال کو ہر طرف سے سمیٹتا جاتا ہے اور مارے بُخل کے اسے گن گن کر رکھتا ہے ۔ گویا یہ مال کبھی اس سے جدا نہ ہو گا ۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے مال تو قبر تک بھی ساتھ نہ جائے گا ، آگے کیا کام آئے گا ۔ سب دولت یونہی پڑی رہ جائے گی اور دولت کی حرص میں مبتلا دولت کا یوں جمع کرنے والا ، دوزخ میں داخل کیا جائے گا ۔ (اعاذنا اللّٰہ من ذالک)

آج کے انسان میں روپے پیسے کی ہوس اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ بعض اوقات شرفِ انسانیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے ۔ یہ خواہش کہ ہم راتوں رات مالدار بن جائیں ، ہم سے ہر وہ کام کرا لیتی ہے جو اخلاقاً انتہائی مذموم اور قانوناً ممنوع ہو ۔

حرص و ہوس کے اس روگ کا علاج علمائے اخلاق نے "قناعت" بتایا ہے۔
قناعت ایک زبردست اخلاقی اور روحانی صفت ہے۔ جو شخص قناعت کی صفت سے متصف ہوتا ہے، وہ حرص و حسد جیسی مہلک روحانی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ اللہ نے اسے بخشا ہے وہ اس پر صابر و شاکر رہتا ہے اور دوسروں کو اللہ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے، وہ ان کے پاس اس نعمت کے زائل ہو جانے کی تمنا نہیں کرتا۔
قانع آدمی حرص و لالچ میں مبتلا نہیں ہوتا اور اس طرح وہ ان اخلاقی برائیوں سے بچا رہتا ہے جو حرص و آز کے سبب پیدا ہوتی ہیں اور جن میں دوسروں کی حق تلفیاں ہوتی ہیں۔
شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

گفت چشم تنگ دنیا دوست را
یا قناعت پر کند یا خاک گور

دنیا کو دوست رکھنے والے کی تنگ آنکھ یا تو قناعت بھرتی ہے یا پھر قبر کی مٹی ــــــ جو شخص دنیا کی ہوس رکھتا ہے، ہر وقت اس فکر میں رہتا ہے کہ دنیا کا مال سمیٹ لوں، دنیا کا مال جمع کروں ــــــ ایسے شخص کی چشم حرص کبھی نہیں بھرتی۔ اور وہ مرتے دم تک اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ ایسے شخص کو دنیا میں صرف قناعت اختیار کرنے میں سکون و چین میسر آتا ہے۔
لیکن قناعت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہا جائے اور سعی و کوشش ترک کر دی جائے ؎

رزق ہر چند بے گماں برسد
شرط عقل است جستن از درہا

اگرچہ رزق بے گمان ملتا ہے۔ جس کو قرآنِ حکیم کی زبان میں "رزق کریم" فرمایا گیا ہے۔ لیکن رزق کی تلاش، اس کی جستجو شرط عقل ہے۔ اس کی تلاش کرنا اور اسکے حصول کی سعی و کوشش کرنا مطلوب و محمود ہے۔
مطلب یہ ہے کہ اسباب رزق کی تلاش انسان کے ذمہ ہے لیکن اس سعی و کوشش کے نتیجہ میں اسے جو کچھ حاصل ہو، اس پر قناعت اختیار کرنا ضروری ہے ؎

گرچہ بیرون ز رزق نتواں خورد | در طلب کاہلی نشاید کرد
غواص اگر اندیشہ کند کام نہنگ | ہرگز نہ کند دُرّ گراں مایہ بچنگ

اگرچہ رزق باہر سے ملنا یقینی نہیں مگر اس کی طلب و تلاش میں کاہلی و سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے۔ غوطہ خور اگر اس سے ڈرے گا کہ سمندر میں غوطہ لگانے سے اسے مگرمچھ نگل جائے گا، تو وہ سمندر کی تہہ سے قیمتی موتی ہرگز نہیں لا سکتا، گویا سمندر سے موتی کا حصول بغیر غوطہ لگائے اور جان کو خطرہ میں ڈالے، ممکن نہیں، ورنہ یوں تو سنگ ریزے ساحل سمندر پر بہت ——— لیکن اگر باوجود کوشش کے اور غوطہ لگانے کے، اُس کے ہاتھ موتی نہ آئے یا صرف ایک آدھ موتی ہاتھ آئے تو اسے اس پر قناعت اختیار کرنی چاہیئے، اور اگر دوسرے غوطہ خوروں کو زیادہ موتی ہاتھ آجائیں تو ان سے حسد نہ کرنا چاہیئے۔

قناعت، گدائی اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے روکتی ہے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں ؎

ہر کہ بر خود درِ سوال کشاد | تا بہ میرد نیاز مند بود
آز بگزار و بادشاہی کن | گردن بے طمع بلند بود

جو کوئی شخص اپنے اوپر سوال کے دروازہ کو کھولتا ہے۔ یعنی کسی سے سوال کرتا ہے خیرات مانگتا ہے، وہ تادم زلیست دوسروں کا نیاز مند ہی رہتا ہے۔ اس لئے اے بھائی! حرص چھوڑ، اور بادشاہی کر، بے لالچ شخص کی گردن ہمیشہ بلند و فراز رہتی ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے گردن اٹھا کر بے نیازانہ چلتا ہے اور اس کی عزتِ نفس قائم رہتی ہے۔

قومی تنظیم

قرآن کریم اول مرحلہ میں پوری انسانیت کو ایک وحدت " ملت واحدہ " قرار دیتا ہے اور اس وحدت انسانی کا سب سے بڑا پیامبر ہے، گویا انسان ہونے کے رشتہ سے تمام انسان ایک ہی " انسانی تنظیم " کے فرد ہیں، اور ان میں باہم کوئی فرق و امتیاز نہیں، اگر ہے تو وہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

گویا دوسرے مرحلہ پر تقویٰ کی بنیاد پر " ایمانی وحدت " وجود میں آتی ہے چنانچہ انسانی وحدت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق دو وحدتوں یا تنظیموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وحدت ایمانی اور دوسری وحدت غیر ایمانی۔ ایک وہ وحدت ہے جو اللہ اور اس کے پیغمبروں اور ان کی سچی تعلیمات پر ایمان رکھتی ہے اور دوسری وہ وحدت ہے جو خدا کی منکر ہے اور رسولوں کی تعلیمات کا انکار کرتی ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ملت ایمانی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق اپنی تنظیم کرتی ہے اور ملت کفر اپنے بنائے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کے تحت کام کرتی ہے۔ جن کی بنیاد سراسر وقتی مصلحت پر ہوتی ہے۔ وقت اور مصلحت بدل جانے کے ساتھ وہ اصول اور ضابطے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ملت ایمانی قومی تنظیم کے کچھ بنیادی اصول اور ضابطے رکھتی ہے جو زمانہ کے سرد و گرم اور گردش لیل و نہار سے محفوظ رہتے ہیں۔

چنانچہ ایمانی یا اسلامی نقطہ نگاہ سے قومی تنظیم کا پہلا اصول اخوت اور مساوات ہے کہ سب اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی اور حقوق و فرائض میں مساوی درجہ

رکھنے میں جو ایک کا حق ہے وہ دوسرے کا فرض اور جو ایک کا فرض ہے وہ دوسرے کا حق ۔ ایمان کی بنیاد پر قومی تنظیم کا دوسرا اصول "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" ہے کہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور ظلم کے معاملے میں بالکل ساتھ نہ دو ۔ اس اصول پر کاربند رہنے کا ایک واضح نتیجہ نیکیوں کے فروغ اور برائیوں کے استیصال کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور وہ قوم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کو بہ طریق احسن انجام دینے لگتی ہے ۔

قومی تنظیم کا ایک اور اصول "توافق للبقا" ہے ۔ کہ ملت کے دوسرے تمام افراد کے ساتھ مل جل کر حیات انسانی کے رشتوں کو اس کے تمام تر تقاضوں کے ساتھ باقی اور قائم رکھا جائے ۔ اور قوم وملت کا کوئی فرد جائز انسانی ضروریات کے لئے نہ صرف یہ کہ حصول اور تکمیل کے لئے یکساں اور مساوی حقوق اور مواقع رکھتا ہو بلکہ تنظیمی نقطہ نگاہ سے اس کا کوئی فرد ان جائز ضروریات کی تکمیل سے محروم نہ رہے ۔ "توافق للبقا" کا یہ قرآنی اصول "تنازع للبقا" کے اصول کے خلاف صف آرا ہو کر باہمی مخاصمت کے بجائے باہمی موافقت واتحاد پر زور دیتا ہے ۔ وہ ملت کے ایک سے زائد قبیلوں کو دو متحارب (باہم لڑنے والے) گروہوں کی شکل میں پیش نہیں کرتا جن میں سے ہر ایک کا مقصد دوسرے قبیلے یا گروہ کو ذلیل وخوار کر کے ناکام ونامراد بنانا ہوتا ہے جو بالآخر باہمی عداوت اور طبقاتی کشمکش کی شکل میں اس قوم میں زہر کی طرح سرایت کر جاتا ہے بلکہ وہ آپس کے بھائی چارے ، اخوت ، برابری اور باہمی تعاون کی بنیاد پر ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسے کی فضا میں اجتماعی کفالت کے ساتھ قومی ترقی اور خوشحالی کے لئے سرگرم عمل رہتا ہے ۔

اسلام قومی تنظیم کی بنیاد ایک متوازن عدل اجتماعی پر رکھتا ہے وہ معاشرے کو HAVES اور HAVES NOT میں تقسیم نہیں کرتا وہ چند ہاتھوں میں دولت کے جمع ہونے کا مخالف ہے کہ ایک یا چند اشخاص کے پاس بے اندازہ دولت جمع ہو جائے اور قوم کی اکثریت نان شبینہ کو محتاج ہو ۔ اسلام اس صورتِ حال کو ہرگز برداشت نہیں کرتا ۔

اسلام کے ان ہی اصولوں کی بدولت جس میں ایمان وعقیدے کی پختگی اور رنگ آمیزی شامل تھی صدر اسلام کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کی قومی تنظیم کس طرح کی گئی۔ یہ دراصل قرآنی تعلیمات اور آنحضرت کی انقلابی سیادت اور قائدانہ ہدایت کا نتیجہ تھا کہ عرب کے خاک نشین اور بادیہ نورد، بکریاں اور بھیڑیں چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا کے مالک بن بیٹھے۔

اسلام نے قومی تنظیم کے سلسلے میں ایک انقلابی تصور اور نظریہ یہ پیش کیا کہ کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ اور یہ کہ ہر شخص قانون کے سامنے جواب دہ ہے۔ محاسبے اور احتساب سے کوئی شخص نہیں بچ سکتا۔ یہ محاسبہ اور احتساب صرف اس دنیا تک ہی نہیں بلکہ آخرت میں بھی ہے اور آخرت کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ ان بطش ربک لشدید۔ محاسبے اور احتساب کے اس اصول نے ہر فرد کو متنبہ اور آگاہ کر رکھا ہے کہ جو کوئی بھی انفرادی یا اجتماعی حقوق پر ڈاکہ ڈالے گا، عدل وانصاف کے بجائے ظلم وناانصافی کو اپنائے گا۔ سماجی عدل کے بجائے سماجی ناہمواریوں کو فروغ دے گا۔ وہ شخص خواہ کتنا ہی بڑا اور صاحب حیثیت کیوں نہ ہو مکافات عمل کے قانون کی زد میں آئے بغیر نہ رہے گا۔ دنیا و آخرت میں جوابدہی کا یہ تصور کسی قوم کے افراد میں جس حد تک ان کے سامنے رہے گا، اسی حد تک وہ برائیوں سے مجتنب اور نیکیوں کی طرف مائل رہیں گے جس سے بالآخر قومی تنظیم مستحکم تر ہوگی اور بے ایمانی، رشوت اقربا نوازی اور ناانصافی کے ذریعے قومی تنظیم میں جو رخنے پڑ جاتے ہیں ان سے محفوظ رہے گی۔

قائداعظم علیہ الرحمتہ نے ہمیں یقین، اتحاد، تنظیم کے تین زریں اصول دیئے تھے۔ جو درحقیقت کسی قوم کی ترقی کیلئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جو قوم اپنے عقیدے اور فکر پر یقین نہ رکھتی ہو اس کی حیثیت ایک کھوکھلی لکڑی سے زیادہ نہیں ہوتی جو قوم اتحاد کی بجائے نفاق کو اپنا شعار بنائے رکھتی ہے اس کی حیثیت تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں سے کی سی ہوتی ہے۔ اور جو قوم تنظیم سے عاری ہوتی ہے اس کی حیثیت بھیڑ ول

کے ایک ایسے گلّے کی ہوتی ہے جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔ جس کا جدھر منہ اٹھے چلی جائے۔
اگر ہم پاکستان کو ایک مضبوط اور توانا قوم دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں باہمی اختلافات ترک کرکے یقین و عمل کے ساتھ تخلیق پاکستان کے مقصد کے حصول کی جدوجہد میں ایک نئے حوصلے، نئے عزم، نئی لگن اور نئے ولولے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ اور یقین، اتحاد اور تنظیم کے اصولوں کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔
تخلیق پاکستان کے مقصد کا حصول اگر قوم کا نصب العین بن جائے۔ اور نصب العین کے حصول کے لئے مصلحت کوشی اور مصلحت بینی کے خول سے باہر نکل کر صدق و ایمان کے ساتھ جدوجہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں لیکن اس کے لئے صدق و اخلاص کے ساتھ اسلام کی دعوت کو عام کرنے اور اس کے ماننے والوں کی علمی اور فکری اور اخلاقی تربیت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ کسی قوم کی تنظیم عقیدے و اخلاق کی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔
لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ہی سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمان قوم کی تنظیم کا رہبران تمام اوصاف کا حامل ہونا چاہیے، جن کی توقع قوم کے ان اوصاف سے متصف افراد سے کی جاسکتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اسلامی عقیدے اور عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کے لئے، ساری قوم کے لئے، ساری ملت کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہو۔

گواہی

اسلام اور اس کے قانون میں گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسلامی قانون غالباً دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس نے مختلف جرم یا واقعے کے ثابت کرنے کے لئے کم از کم تعداد گواہان کا تعین کر دیا ہے۔ اسلام میں گواہی کی اہمیت کے پیش نظر گواہ کے اوصاف بھی متعین ہیں کہ گواہ کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئے۔ چنانچہ گواہی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ گواہی دینے والا عادل ہو۔ وہ اپنے فسق و فجور میں مشہور نہ ہو۔ کیونکہ اگر ایک شخص اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتا ہو، اور فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو تو اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے معاملات میں بھی عدل و انصاف سے کام لے گا اور جھوٹ و افترا پردازی سے گریز کریگا۔ حضورؐ کا فرمان ہے "ان الصدق ینجی والکذب یُھلک" سچائی نجات ہے اور جھوٹ باعث ہلاکت۔ وہ شخص جو جھوٹا اور کسی معاملے یا مقدمے میں جھوٹی گواہی دے اس پر دوہرا بوجھ ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب کی، اور دوسرے یہ کہ ناحق کی حمایت کر کے حقدار کو اس کا حق ملنے سے روک دیا اور جس کا حق نہ تھا، اس کو بے جا نفع پہنچانے کا سبب بنا۔ سورۃ نساء آیت ۸۵ میں آتا ہے کہ جو شخص اچھے کام کی سفارش کرے تو اس کے ثواب میں اس کو حصہ ملتا ہے اور جو بُری بات کی سفارش کرے تو اس کو اس کے عذاب میں حصہ ملے گا۔ گواہی بھی ایک قسم کی شرعی سفارش ہی ہے۔ جس کے ذریعہ ایک گواہ حاکم عدالت کو مطلوبہ فیصلہ کرنے کی رغبت دلاتا ہے یا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ جھوٹی گواہی دینے والا دراصل ظلم کا مرتکب

ہوتا ہے اور قرآن کے الفاظ میں " ومن یفعل ذالک عدوانًا وظلما فسوف نصلیہ نارًا " ، جو شخص تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا ، ہم اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کرینگے۔

گواہی دراصل خدا کی ایک امانت ہے جو بندے کے پاس ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو کسی واقعہ کے بارے میں علم ہو اور اس سے دریافت کیا جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ صحیح صحیح بات جو اس کے علم میں ہے حاکم عدالت کو بتا دے۔ سورۂ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ " ومن اظلم ممّن کتم شھادۃً عندہ من اللہ " کہ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا کہ خدائے تعالیٰ کی گواہی کو جو اس کے پاس ہو چھپائے۔ اسی سورہ میں ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ " ولا تکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ آثم قلبہ۔ واللہ بما تعملون علیم " یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو کوئی شخص گواہی کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے ، اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خوب واقف ہے۔

آجکل بہت سے لوگ گواہی دینے سے گریزاں رہتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کو بار بار عدالت میں دھکے کھانا پڑتے ہیں۔ مقدمہ ایک پیشی سے دوسری پیشی کے لئے ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ گواہ دن دن بھر بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے ہیں کہ کب پکار ہو اور ان کو کمرۂ عدالت میں بلا یا جائے۔ بلاشبہ موجودہ مادی دَور میں ہر شخص سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر بار بار حاضر عدالت ہوتا رہے گا۔ اس کے لئے عدالتوں کو " لا یضارّ کاتب ولا شھید " کے حکم قرآنی کی تعمیل میں کہ گواہوں کو ضرر و نقصان نہ پہنچے ، خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ جن مقدمات میں گواہ موجود ہوں اوّل وقت اور پہلی پیشی پر ان کی گواہی قلم بند کر کے رخصت کر دیا جائے اور گواہوں کو بھی حکم قرآنی " ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا " کہ گواہی کے لئے گواہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں ، کی تعمیل میں عدالت میں جا کر گواہی دینے سے انکار یا لیت و لعل سے کام نہ لینا چاہیئے۔

سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تعلیم و ہدایت فرماتا ہے۔ " یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوّامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ،

ان یکن غنیاً او فقیرا فاللّٰہ اولیٰ بہما فلا تتبعوا الھوی، ان تعدلوا، وان تلوٗا او تعرضوا، فان اللّٰہ کان بما تعملون خبیرا "۔ اے مسلمانو! انصاف پر قائم رہو اور خدا سے ڈرتے ہوئے گواہی دو یعنی سچی بات کہو، اگرچہ وہ گواہی خود تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ یا عزیزو اقارب کے خلاف ہو۔ اگر کوئی شخص مالدار یا مفلس ہے تو اللہ تعالیٰ اسکا تم سے زیادہ نگہبان ہے۔ تم انصاف کو چھوڑ کر اپنے نفس کی خواہش پر مت چلو اور اگر گواہی میں پیچ ڈالو گے یعنی گھما پھیر کر بات کرو گے یا بچا جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

سورۂ مائدہ میں یہی مضمون ذرا دوسرے انداز سے بیان ہوتا ہے کہ " یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین للّٰہ شھداء بالقسط، ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی، واتقوا اللّٰہ، ان اللّٰہ خبیر بما تعملون " کہ اے مسلمانو! خدا کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے پر مستعد رہو اور لوگوں کی دشمنی تم سے بے انصافی نہ کرائے۔ انصاف کرو، انصاف ہی پرہیزگاری تک پہنچنے کی نزدیک ترین راہ ہے اور اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

آجکل ہمارے معاشرے میں پیشہ ور گواہوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو روپیہ لیکر ہر قسم کی جھوٹی گواہی دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اسلام ایسے لوگوں کو سخت تنبیہہ کرتا ہے۔ گواہی سے مقصود دنیاوی منفعت نہ ہونا چاہیئے۔ گواہی خالص اللہ کے لئے ہے اور اس کا اجر بھی اللہ ہی کے ہاں ملے گا۔ جو لوگ گواہی کو اپنا پیشہ بنا کر اس سے دنیا کی کمائی کرتے ہیں وہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور ان کے لئے قیامت کے دن اللہ کی پکڑ بڑی زبردست ہوگی۔ سورۂ مائدہ کی آیت " لا نشتری بہ ثمنا ولو کان ذا قربی " کہ ہم کو اس گواہی سے دنیا کمانا منظور نہیں ہے، گو جس کے لئے ہم گواہی دیں وہ ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، قرآن کا صریح ضابطہ ہے کہ گواہی کو تم اللہ ہی کے لئے خاص کر دو۔

معاشرے میں اسلامی قانون کا مقام

معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے اور قانون معاشرہ کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر متمدن انسانی معاشرہ کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اسی قانون کے ذریعہ معاشرہ کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے، فرائض ادا کئے جاتے ہیں۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ معاشرہ کے افراد جو مختلف پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نظام کے تحت قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں۔ مختصر یہ کہ انسانی فطرت کے تقاضے اس قدر گوناگوں اور اس کی ضروریات اس قدر متنوع ہیں کہ معاشرہ کو ایک قانونی نظام کی بنیاد پر استوار کئے بغیر اس کی تکمیل نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اگر قانون ابتدائی تعلیم جبری قرار دیتا ہے تو اس لئے کہ معاشرہ جاہل نہ رہے، اگر معاشرہ مجرموں کو سزا دیتا ہے تو اس لئے کہ معاشرہ میں جرائم کا سدِ باب ہو اور لوگ امن و سکون سے اپنی زندگی گزار سکیں، اگر قانون ظلم و استحصال کے خلاف ہے تو اس لئے کہ کمزور کی حق تلفی نہ ہو، غرض قانون اور معاشرہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عقیدۂ توحید اور مساوات

اسلام جس معاشرہ کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ عقیدۂ توحید پر مبنی ہے۔ یعنی وہ خونی و نسبی رشتہ کی بجائے عقیدہ پر زور دیتا ہے۔ اسلام معاشرہ کی تشکیل کے لئے قبائلی کثرت کی جگہ اعتقادی وحدت پر یقین رکھتا ہے۔ رنگ و نسل کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ بقول خداوندی "انما المومنون اخوۃ" سب مسلمان آپس میں بھائی

ہیں۔ چنانچہ اعتقادی وحدت کے بعد اسلامی قانون جس چیز پر زور دیتا ہے وہ معاشرتی مساوات ہے۔ سورۂ حجرات کی ۱۲ ویں آیات میں قرآن نے صاف صاف اعلان کرتا ہے:۔

"یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ و جعلنٰکم شعوباً و قبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔"

"اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو، تحقیق تم سب میں اللہ کے نزدیک وہی مشرف و مکرم ہے، جو زیادہ پرہیزگار و متقی ہے"۔ اس آیت کے ذریعہ یہ قاعدۂ کلیہ بیان ہو رہا ہے کہ کسی شخص کا ایک خاص قبیلہ یا خاندان یا خطے سے متعلق ہونا کسی فضیلت کا باعث نہیں، اصل چیز تقویٰ ہے۔ دراصل اسلامی معاشرہ چار اجزاء سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ اللہ کی ذات ہے، اور دوسرے یہ کہ اس ذات کے سامنے انسان سراپا اطاعت ہے، تیسرے یہ کہ ایک مکمل نظامِ فکر و عمل جو اس حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کے زیرِ اثر ہے اور چوتھے جزا و سزا کا تصور۔ قرآن کہتا ہے "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ، ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" اسی طرح سورۂ حم السجدہ کی ۴۶ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا" یعنی جس شخص نے نیک عمل کیا وہ اس کے اپنے نفع کے لئے ہوگا۔ اور جس شخص نے برا عمل کیا، اس کا وبال اسی کے ذمہ پڑے گا۔ یہ ہے وہ تصور جو اسلام معاشرہ کے بارے میں رکھتا ہے۔

قانونِ اسلامی کا نظریہ اب قانونِ اسلامی کی طرف نظر ڈالیے۔ اسلامی قانون کا نظریہ مغربی قوانین سے قطعاً مختلف ہے۔ مغربی فلاسفہ اور ماہرینِ قانون اس نظریہ کے حامل نظر آتے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں

بیک وقت قانون اور اخلاق کے دو معیاری نظام پائے جاتے ہیں۔ جن کو وہ (Normative System) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے کہنے کے بموجب یہ دونوں نظام بعض مقامات پر ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں اور بعض مقامات پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ کانٹ نے قانون اور اخلاقیات کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قانون ہمارے خارجی طرز عمل یعنی (External Conduct) کو تجویز (Prescribe) کرتا ہے اور اخلاق یعنی (Morality) ہمارے داخلی طرز عمل کو متعین کرتا ہے۔ اسی طرح مشہور انقلابی مفکر کیلسن اخلاقی تصورات کو قانون میں سمو دینے کا سخت مخالف ہے۔ اس کے خیال میں اخلاقیات محض ایک موضوعی (Subjective) چیز ہے اسلئے اسے قانون کے سائنسی مطالعہ میں بحیثیت معروضی یعنی (objective) حقیقت کے شامل نہیں کیا جا سکتا۔ کیلسن کی یہ رائے دراصل مجرد قانون (Pure Law) کے نظریہ پر مبنی ہے۔

اسلامی قانون کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی قانون اپنے اندر مذہبی اور اخلاقی نظام سموتے ہوتے ہے۔ اس لئے اسلامی قانون کا دائرۂ عمل مغربی قوانین کے مقابلہ میں نظریاتی اور عملی دونوں اعتبارات سے وسیع تر ہے۔ وہ ایک ایسے ہدایتی اور واجبی (Imperative) عنصر کا مالک ہے جو اپنی ہیئت اور مزاج میں دنیا کے دوسرے قوانین سے منفرد اور ممتاز ہے۔ وہ آزاد معاشرہ کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر یکساں توجہ دیتا ہے۔ "انما الاعمال بالنیات" کہہ کر انسان کے خارجی عمل کو اس کی داخلی نیت کے ذریعہ متعین کرتا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے۔ جس میں دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اس کا حریف نہیں۔

حقوق معاشرت معاشرہ کا سب سے چھوٹا یونٹ ایک خاندان ہوتا ہے۔ جس میں مرد و عورت یعنی شوہر و زوجہ، والدین و اولاد اور دیگر قریبی افراد شامل ہوتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اسلامی قانون اس

بارے میں کیا ہدایات دیتا ہے۔ سب سے پہلے شوہر اور زوجہ کو لیجئے۔ اسلامی قانون ازدواج ایک ایسا قانون ہے۔ جو قوانین تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام کا یہ قانون جو سب سے زیادہ معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عدل و توازن، انصاف و رواداری، اخلاق و عصمت کی محافظت، باہمی محبت و مودت مقاصدِ نکاح کے حصول، نجات اُخروی، مصلحت عامہ اور انسانی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک خاندان کا سربراہ مرد کو قرار دیتا ہے اور "الرجال قوامون علی النساء" اور للرجال علیہن درجۃ" کہہ کر یہ حقیقت واشگاف انداز میں بیان کر رہا ہے کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں، خاندانی نظم و ضبط، اس کی دیکھ بھال میں مردوں کو اولیت حاصل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب کچھ مرد ہی ہے، بلکہ مرد کو یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ "ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف" یعنی عورتوں کو بھی حسن سلوک کا ویسا ہی حق ہے جیسا کہ مردوں کو ان پر حاصل ہے مزید صراحت کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ "عاشروھن بالمعروف" یعنی عورتوں کے ساتھ ہمیشہ حسن معاشرت اختیار کئے رہو۔

نفقہ انسان طبعاً بخیل واقع ہوا ہے، بعض اوقات اپنی بیوی بچوں پر بھی خرچ کرنے کے معاملہ میں اس کی طبیعت میں تنگی آجاتی ہے اور کبھی کبھی وہ مال کو جمع کرنے کی ہوس یا آئندہ غربت کے خوف سے اپنے بیوی بچوں کے نفقہ کا برابر خیال نہیں رکھتا۔ اس کے لئے سورۃ طلاق کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا

یعنی وسعت والے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور

جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہیئے کہ اللہ نے اس کو جتنا دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ مکلف نہیں ٹھہراتا۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی تنگی کے بعد فراخی دے گا۔

تعداد ازدواج اسلامی قانون "لا متخذی الاخدان" کہہ کر علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات پیدا کرنے والوں کو سخت تنبیہہ کرتا ہے۔ وہ ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کو بشرط عدل جائز ضرور قرار دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ تاکید بھی کرتا ہے کہ "فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ" یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری عورت گویا معلق رہ جائے ـــــ مطلب یہ ہے کہ ایسا طرز عمل اختیار مت کرو کہ وہ اللہ کی قائم کردہ حدود توڑنے پر مجبور ہو۔

طلاق خوش اسلوبی سے رہنے سہنے اور ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل کی تلقین کے بعد اسلامی قانون ایک ایسی صورت کا بھی ذکر کرتا ہے کہ جب زوجین ایک دوسرے کے ساتھ حسن معاشرت جاری نہ رکھ سکیں اور انہیں یہ خدشہ لاحق ہو کہ وہ اللہ کی قائم کردہ حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ایسی صورت میں "فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا" کہ ایک حکم شوہر کے خاندان سے اور ایک حکم بیوی کے خاندان کا ہو تاکہ مصالحت کرادی جائے، اور اگر مصالحت ممکن نہ ہو تو خلع، مبارات اور طلاق و تفریق کے احکام بیان کرتا ہے اور کوئی پیچیدگی ایسی نہیں چھوڑتا جس کو عدل کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔

حضانت طلاق یا تفریق کی صورت میں نابالغ بچوں کی حضانت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی قانون اس کا یہ حل پیش کرتا ہے کہ لڑکا سات سال کی عمر تک اور لڑکی بالغ ہونے تک اپنی ماں کے پاس رہ سکتی ہے اور باپ ان بچوں کے نان و نفقہ تعلیم و رہائش وغیرہ کا ذمہ دار ہوگا۔ دراصل اسلام معاشرہ کو برائیوں سے خالی اور حسنہ و نیکیوں سے بھر دینا چاہتا ہے۔ ایک حدیث

ہے "من لم یکرم کبیرنا ومن لم یرحم صغیرنا فلیس منا او کما قال" کہ جس نے ہمارے بڑے کی عزت نہیں کی اور جس نے ہمارے چھوٹے کے ساتھ شفقت و مہربانی کا برتاؤ نہیں کیا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ ہدایت معاشرہ اور باہمی ربط و سلوک کی ایک محکم بنیاد ہے تاکہ معاشرہ کے افراد میں ایک دوسرے کے لئے احترام و شفقت موجود ہو اور معاشرہ میں حسن اخلاق رواج پاتے۔

اسراف

معاشرہ میں زر و دولت کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی قانون "کلوا واشربوا"، یعنی کھاؤ پیو کی اجازت دیتا ہے مگر اسراف سے منع کرتا ہے۔ اسراف کا ترجمہ عام طور پر فضول خرچی کیا جاتا ہے۔ دراصل اسراف قدر ناشناسی کا دوسرا نام ہے یعنی ایک معتدل اندازہ سے زیادہ خرچ کرنا، جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی سفاہت یعنی کم عقلی کے سبب اسراف کا مرتکب ہونے لگے تو اسلامی قانون کے تحت اس کے مالی تصرفات پر پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے۔

وصیّت و میراث

مالی اور معاشرتی امور میں مزید استحکام پیدا کرنے کی غرض سے وصیت و میراث کا اسلامی قانون موجود ہے۔ ہر مسلمان اپنے ترکہ کی ایک تہائی کی حد تک کسی غیر وارث کے حق میں وصیّت کرنے کا مجاز قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد تمام ورثاء کے حصے قرآن پاک اور حدیث نبوی کے ذریعہ متعین ہیں۔ تاکہ دولت کے ارتکاز یا غیر منصفانہ تقسیم سے انسانی معاشرہ میں جو مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کا ازالہ کیا جاسکے اور آپس میں محبت و تعلق کا رشتہ منقطع نہ ہونے پاتے۔

پڑوسیوں کے حقوق

خاندانی زندگی کے لئے معاشرہ کے ایک چھوٹے مگر بنیادی یونٹ سے متعلق اسلامی قوانین کی طرف یہ چند اشارے ہیں۔ گھر یا خاندان سے باہر نکلیے تو آپکا واسطہ پڑوسی سے پڑے گا۔ پڑوسی کے جو حقوق اسلام بیان کرتا ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے معاشرے

میں اس کی نظیر ملے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ پڑوسی کا حق شفعہ اسلامی قانون کے اس پہلو کی ایک واضح مثال ہے۔

حلال روزی ایک وسیع معاشرہ کے فرد ہونے کی حیثیت سے انسان کا سب سے پہلا قدم کسب معاش ہوتا ہے۔ حلال روزی پیدا کرنے کے لئے اسلام اور اس کا قانون بے حد زور دیتا ہے۔ قرآن واشگاف الفاظ میں اعلان عام کرتا ہے۔ "احل اللہ البیع وحرم الربوا" کہ اللہ نے بیع یعنی خرید و فروخت کو حلال کیا اور سود کو حرام۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اپنی قبروں سے حشر کے دن اسی طرح اٹھیں گے جیسے وہ شخص اٹھتا ہے۔ جس کو آسیب نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو —— یہ ایک اقتصادی ضابطہ ہے۔ جس پر اسلامی قانون مسلمانوں کی معیشت کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔

قرض کی ادائیگی ساتھ ہی وہ قرضوں کی ادائی کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ اول تو وہ کہتا ہے کہ قرض ہی مت لو، یہ تمہاری اقتصادیات کو گھن کی طرح چاٹ جائیگا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "رات کو بھوکے سو رہنا اس سے بہتر ہے کہ جب تم صبح کو اٹھو تو تمہاری گردن پر کسی کا قرض ہو" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات نماز جنازہ پڑھانے سے پہلے دریافت فرما لیتے تھے کہ میت پر کوئی قرض تو نہیں، مراد یہ تھی کہ اگر ہے تو فوراً ادا کر دیا جائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "اگر کسی شخص پر کوئی قرضہ ہے اور وہ اس کو ادا کئے بغیر مر گیا تو یہ قرضہ اس میت اور جنت کے بیچ میں ایک آڑ اور رکاوٹ بن جاتا ہے" اس لئے اسلامی قانون میں حقوق العباد کی طرف خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ حتیٰ کہ سورۃ نساء میں جہاں قرآن پاک میت کے ترکہ کی ورثاء میں تقسیم کا ذکر اور ان کے حصے بیان کرتا ہے وہاں بار بار یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ پہلے میت کے ذمہ وصیت و میراث سے قرضے ادا کئے جائیں۔

امانت کی واپسی قرضوں کی ادائی کی طرح امانتوں کو ان کے حقداروں تک پہنچانے کا بھی حکم ہے "ان اللہ یامرکم ان تودوا

الا مانات الی اھلھا " اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دو۔ پھر کہتا ہے " لا تخونوا اماناتکم " امانتوں میں خیانت نہ کرو۔ ایک اور حکم دوسروں کا مال ناحق نہ کھانے کے متعلق ہے کہ " لا تاکلوا اموال الناس بالباطل " کہ لوگوں کا مال حرام طریقہ پر مت کھاؤ "۔ اس میں تحریم رشوت کا حکم بھی پوشیدہ ہے۔

ناپ تول

اسلامی قانون عام تجارتی معاملات میں " اوفوا الکیل والمیزان بالقسط " ناپ تول کو انصاف سے پورا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک سورۃ تطفیف میں کہتا ہے کہ " ان لوگوں کے لیئے دائمی حسرت و ناکامی ہے۔ جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو یقین نہیں کہ وہ مر کر ایک بڑے ہولناک دن کے لیے اٹھائے جائیں گے، جس دن سارے جہانوں کے مالک کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینے کو کھڑے ہوں گے "۔

اسلامی قانون " اوفوا بالعقود " کہہ کر معاہدات کی پابندی کرنے پر زور دیتا ہے کہ روز قیامت تم سے تمہارے وعدوں کے بارے میں پوچھا جائیگا!

انسان محض معاشی حیوان نہیں

اسلام ایک مسلمان کے لئے محض معاشی حیوان بننا پسند نہیں کرتا جو رات دن اپنی تجوری کو بھرنے میں لگا رہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہر مسلمان کا انفرادی اور اجتماعی فریضہ قرار دیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ معاشرہ میں امور خیر کی انجام دہی کے لئے یاد دلاتا ہے کہ تمہارے اموال میں " حق للسائل والمحروم " سائل اور محروم کے لئے بھی حق ہے۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو، اے رسول! لوگ آپ سے خرچ کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجئے کہ جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ " انفقوا فی سبیل اللہ " کے حکم قرآنی کے ساتھ " لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون " بھی ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرو جو تم کو محبوب ہو۔ اس کے بغیر تم نیکی

کا درجۂ کمال ہرگز حاصل نہ کر سکو گے۔

یہاں تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں، اس قدر عرض کر دوں کہ تقریباً پانچ سو آیاتِ قرآن پاک کی ایسی ہیں جو اسلامی قوانین و احکام سے متعلق ہیں اور رسول کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کی ہزارہا احادیث و آثار موجود ہیں جن سے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے خدوخال بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

تعزیری قوانین

اب ذرا تعزیری قوانین کی طرف آئیے۔ انسان کی صفت اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے: "ظلوماً جهولاً" یہ انسان کے ظالم ہونے پر صریح نص ہے۔ وہ معاشرے پر مختلف انداز سے ظلم ڈھاتا ہے۔ ان میں اس کے وہ افعال جو پورے معاشرہ کو گندگی اور خرابی اخلاق کا موجب اور متعدی ہوں ان کی طرف اسلامی قانون تعزیری معاملہ میں اپنی پہلی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی فوجداری قانون کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جرائم اور سزائیں ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے ثابت ہیں اور دوسری قسم ان جرائم اور سزاؤں پر مشتمل ہے۔ جن کے تعین کے لئے حاکم وقت کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ زمانہ کے حالات کے بموجب جو سزا چاہیں اور مناسب سمجھیں، مجرموں کو دیں تاکہ معاشرہ سے جرائم کا سدِ باب ہو۔

جہاں تک ان جرائم اور سزاؤں کا تعلق ہے جو قرآن پاک میں مذکور ہیں، ان میں سرِفہرست زنا، چوری، قتل اور حرابہ وغیرہ آتے ہیں۔ اسلامی قانون زنا کے جرم کے سلسلہ میں بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے۔ قرآن سب سے پہلے تو یہ حکم دیتا ہے کہ "لا تقربوا الزنا" ——— کہ زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، اور اگر کوئی اس حکم کے باوجود اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو حکم دیتا ہے "!

الزانیۃ والزانی، فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ، ولا تاخذکم بھما رافۃ، فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر، ولیشھد

عذابہما طائفۃ من المومنین ۔ کہ جو عورت و مرد زنا کرے تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہو تو اللہ کے دین کی بات پر عمل کرنے میں ان دونوں سے نرمی نہ برتو —— نیز یہ کہ جس وقت ان کو سزا دی جائے، تو مسلمانوں کا ایک گروہ موجود ہو، تاکہ وہ ان کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر عبرت پکڑیں ۔

اسلامی قانون میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹ ڈالنا ہے ۔ قرآن کا صاف و صریح حکم ہے "والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیہما" کہ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت اُن دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو ۔ اسی طرح اسلامی قانون میں قتل کے جرم کا بدلہ قصاص یعنی جان کے بدلے جان اور اگر مقتول کے ورثار راضی ہو جائیں تو دیت یعنی خون بہا قصاص کا تاوان اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ معاشرہ کے افراد آپس کی خون ریزی سے اجتناب کریں ۔ اسی طرح جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، ان کی سزا قرآن میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا گرفتار کر کے سولی دیدی جائے یا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا قید کیا جائے یا ان کو جلا وطن کر دیا جائے اور اگر وہ (قابو میں آجانے سے قبل) توبہ کر لیں تو انہیں معاف کر دیا جائے ۔ اسلامی قانون دیگر جسمانی جرائم اور ضربات کے سلسلہ میں عدل اور برابری کا مطالبہ کرتا ہے ۔ چنانچہ "ان النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص" کا قائل ہے یعنی یہ کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت، اور زخم کے بدلے اسی جیسا زخم ۔

اسلامی قانون شراب نوشی کو "رجس من عمل الشیطان" کہہ کر حرام قرار دیتا ہے ۔ اس لیے کہ وہ ام الخبائث ہے ۔ دوسری غیر اخلاقی خباثتوں کو

جنم دیتی ہے اور اس کے لئے خلافت راشدہ کے عہد سے اسّی دروں کی سزا مقرر ہے۔

اسلامی قانون "حرّم ربی الفواحش" کی تعمیل میں تمام فواحش اور منکرات کو حرام کرتا ہے اور فحاشی، جنسی بے راہروی، بے حیائی کو قانوناً جرم قرار دیتا ہے۔
اسلامی قانون تعزیر کا وہ خلاصہ جو اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے جو انسانوں کی اچھی اور بری کھلی اور چھپی سب باتوں کو جاننے والا ہے، بیان فرمایا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اسلامی قانون فوجداری سخت گیر واقع ہوا ہے، میں کہوں گا، بیشک اسلامی قانون سخت گیر ہے۔ وہ معاشرہ کو مفاسد سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔ اور شخص ملزم کے حق میں نرم رجحان کے خلاف ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ مسلمان معاشرہ جس اساس پر قائم ہے وہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ مختلف بیرونی اثرات اور عوامل کے باوجود بھی اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کا جذبہ ہمارے معاشرہ کو آج بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے ہوئے ہے۔ میں پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ مسلم معاشرہ کو مجتمع رکھنے والا خدا کا قانون اور اسلامی ضابطہ حیات ہی ہو سکتا ہے۔

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست حالت میں نہیں رہ سکتا۔ اسلام کی مثال ایک بنیاد کی ہے اور حکومت گویا اس کی محافظ ہے جس عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ گر جاتی ہے اور جسکا کوئی نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کی مثال ایک عمارت کی ہے جس کی بنیاد اسلام ہے۔ ضرورت ہے کہ اس بنیاد کو ہر قیمت پر محفوظ رکھا جائے۔ ہمارا انفرادی اور اجتماعی فریضہ ہے کہ ہم اس بنیاد کے باقی اور قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔

مطالعہ کائنات اور اسلام

"کائنات" ایک معرب لفظ ہے جو "کون" سے بنا ہے۔ جس کے معنی عالم وجود کے ہیں۔ گویا کائنات کو ہم عالم موجودات کہہ سکتے ہیں۔ خواہ ان موجودات کا علم ہمیں ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ کائنات کا لفظ ان تمام موجودات کے لئے بولا جا سکتا ہے جو زمینی ہوں یا زیر زمین، بالائے زمین ہوں یا آسمانی یا بالائے آسمان۔ اس میں طبقات الارض، اجرام سماوی اور ان کے درمیان پائے جانے والی تمام مخلوقات و موجودات کائنات میں شامل ہیں، البتہ کائنات کا کلی احاطہ کسی فرد بشر کے بس کی بات نہیں۔

اسلام اس خاکی انسان کو کائنات کے مطالعے کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ کبھی وہ "سیروا فی الارض" کہہ کر زمین پر چلنے پھرنے اور اللہ کی زمینی مخلوقات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مختلف شکلوں اور رنگوں کے چلتے پھرتے انسان، لاتعداد جانور، بے شمار پھل، پھول، پودے، درخت، جنگل، سمندر، پہاڑ غرض انسان کے گرد و پیش اللہ کی قدرت کی بے شمار نشانیاں جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھنے اور ان میں غور کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ کبھی "انظر والی السماء" کہہ کر آسمان، چاند، ستارے، بدلتی ہوئی صبح شام، پھوٹتی ہوئی شفق (کہکشاں) کو دیکھنے اور غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

کائنات سے متعلق قرآن پاک میں چار نکات واضح طور پر مختلف انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ انسان اور دیگر تمام اشیاء ذات واحد اللہ تبارک تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہیں۔

۲۔ اس تمام کائنات کا انتظام وانصرام اللہ ہی کے مقرر کردہ قاعدے اور اصول کے تحت چل رہا ہے۔

۳۔ یہ دنیا انسان کے لئے اس کے استعمال وتصرف کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ اور ساری کائنات کو اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

۴۔ یہ تمام کائنات انسان کے لیے ایک آزمائش اور ایک امتحان ہے۔

اسلام کے نزدیک کائنات کے مطالعے کا بنیادی اور اولین مقصد کائنات کے خالق حقیقی اور موجد اصلی کو جاننا اور پہچاننا ہے۔ کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی اشیاء — زمین، آسمان، جنگل، پہاڑ، سمندر، سمندر میں کھڑے جہاز، دن اور رات کی گردش، چاند سورج اور ستارے، ان سب کو قرآن "آیات" یعنی نشانیوں سے تعبیر کرتا ہے کہ ان نشانیوں کے ذریعے کائنات کے خالق کی ذات کی معرفت حاصل کی جائے۔ چنانچہ مشاہدہ اور مطالعہ کائنات کے ذریعے کائنات کا بنیادی مقصد اور لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کے ذریعے توحید الٰہی کا عقیدہ پیدا ہو اور پختہ ہو۔ اللہ کی شان خلاقیت، ربوبیت اور رزاقیت کا یقین حاصل ہو اور یہ عقیدہ اللہ کی تمام تر صفات کے عرفان کے ساتھ دنیا میں انسانی اعمال کی رہنمائی کا ذریعہ بنے تاکہ انسان کو اس کے خلق و پیدائش کا حقیقی مطلوب حاصل ہو۔

اللہ تبارک تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں کتنی کتنی اور کیسی کیسی مخلوق پیدا کی گئی ہے اور ان مخلوقات کو کیا کیا طاقتیں اور خاصیتیں بخشی گئی ہیں اور ان مختلف النوع مخلوقات سے وہ کیا کیا کام لے رہا ہے۔ ان باتوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ کرۂ ارض کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر رہنے والا انسان اپنے محدود مطالعے اور اپنے گرد وپیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ اس کائنات میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے

حواس اور آلات کی مدد سے محسوس اور معلوم ہوتا ہے تو یہ اس کی سراسر کج فہمی اور نادانی ہے۔ اللہ کی سلطنت کا یہ کارخانہ اس قدر وسیع اور عظیم ہے کہ اس کی پیدا کردہ کروڑوں اربوں اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا بھی یقینی، کلی اور قطعی علم کسی کو نہیں ہو سکتا۔

کائنات کا یہ سارا نظام ایک تنظیم کے تحت قائم ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے نظیر حکمت و دانائی کے تحت جاری و ساری ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نقص تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

" ماترىٰ فی خلق الرحمن من تفٰوت، فارجع البصر ھل ترىٰ من فطور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر"

تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے، پھر پلٹ کے دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔ اللہ کی پیدا کردہ اس کائنات میں کوئی چیز بے جوڑ اور بے توازن نہیں اس کے تمام اجزاء باہم مربوط اور کمال درجے متناسب ہیں۔ پوری کائنات کی بندش ایسی مضبوط اور چست ہے کہ زمین کے ایک چھوٹے سے ذرّے سے لیکر عظیم الشان آسمانوں تک نظم کائنات کا تسلسل کہیں نہیں ٹوٹتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اور اس کی کوئی چیز بے کار نہیں پیدا کی۔ انسان پکار اٹھتا ہے " ماخلقت ھذا باطلاً " اس نظام کے قیام سے مخلوقات کی بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کائنات، نشوونما اور تمدنی ترقی کے لئے کام لیتا ہے۔ کائنات کی یہ تسخیر ارتقائی انداز میں صدی بہ صدی آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کا مقصد ایک انسان کا دوسرے انسان پر حکمرانی کرنے کا حق حاصل کرنا نہیں بلکہ عام انسانیت کی فلاح و بہبود اور باہمی توافق و تعاون ہے۔

کائنات میں کہیں ٹھہراؤ نہیں۔ ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہے۔

چاند کا گھٹنا بڑھنا، دنوں اور راتوں کا مسلسل آنا جانا، خود انسان کی مادی حیات میں بچپن، جوانی، بڑھاپا اور صحت ایک ایک چیز کروڑوں، اربوں سالوں سے قائم ہے۔ قرآن پاک اس نظام کائنات کے ذکر اور استدلال سے یوم آخرت اور روز جزا کی طرف انسان کو متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ دنیا کی ایک ایک چیز بامقصد ہے۔ اس میں خدا کا قانون جاری و ساری ہے۔ وہ خدا جو اس تمام کائنات کو لفظ "کن" سے پیدا کر سکتا ہے تو اسے توڑ بھی سکتا ہے اور توڑ کر پھر اور کسی شکل میں بھی بنا سکتا ہے۔ انسان کو اس حقیقت سے باخبر کرنے کے لئے مختلف انداز سے متوجہ کر رہا ہے کہ اس کائنات میں قانون فطرت کے ساتھ قانون مکافات بھی جاری ہے۔ جس خدا نے یہ تمام کارخانہ قائم کیا۔ یہ امر اس کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر کے یوم آخرت اس کے اعمال و افعال کی بازپرس کرے اور جزا و سزا کا نظام نافذ کرے۔

رب السمٰوات والارض وما بینہما الرحمٰن لا یملکون منہ خطابا۔

رب آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ جس کے سامنے کسی کو لب لینے کا یارا نہیں۔

الذی لہ ملک السمٰوٰت والارض واللّٰہ علی کل شئ شہید

وہ خدا جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تبارک الذی بیدہ الملک، وھو علی کل شئ قدیر

بزرگ ہے اس کی ذات جس کے ہاتھ میں ہے ساری سلطنت اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

فلا اقسم بالشفق، والیل وما وسق، والقمر اذا اتسق لترکبن طبقا عن طبق۔

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں۔ شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ

لیتی ہے اور چاند کی جبکہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان کی دنیاوی ظاہری موت اس کی حیاتِ اصلی کا نقطۂ آخر نہیں بلکہ اس کی حیاتِ مسلسل کا یہ ایک وقفہ ہے۔ اللہ کے مقرر کردہ اندازے اور وقت کے مطابق اسے پھر جی اٹھنا ہے اور اپنے تمام اعمال اور افعال کے لئے اللہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔ یہی اساس انسان کے مطالعہ کائنات کا آخری مقصد ہے، اور اس لحاظ سے یہ کائنات ایک انسان کے لئے امتحان و آزمائش ہے۔

وقت کی قدر و قیمت

قرآن حکیم اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وقت کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں غافل انسان کو بار بار تنبیہ کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے کہ موت کا ہاتھ اچانک تم تک پہنچ جاتے تم اس وقت کو جو تمہیں دنیاوی زندگی کی شکل میں حاصل ہے۔ غنیمت جانو اور اللہ کے احکام کی پیروی کرو۔ شیخ سعدی نے اسی مضمون کو اپنی گلستان میں بڑے خوبصورت اور دلنشین پیرایہ میں یوں نظم کیا ہے ؎

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں بیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اے شخص بھلائی کر اور اپنی اس عمر کو غنیمت سمجھ، اس سے پہلے کہ آواز آئے کہ فلاں شخص اس دنیا میں نہ رہا ـــــ یعنی یہ کہ تیرا مقررہ وقت ختم ہو اور تو مُردوں کی صف میں شامل ہو جائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے؛ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ کہ ہم نے تم کو حیات بخشی تاکہ ہم جانچیں کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے احسن رہا۔ گویا انسان کو جو یہ حیات عطا کی گئی ہے وہ بھی اس امتحان اور جانچ کے لئے ہے کہ ہم نے اس وقت کا جو ہمیں دنیا میں حاصل ہوا، کس طرح استعمال کیا؟ آیا ہم نے اپنی زندگی انفرادی اور اجتماعی خیر کے کاموں میں صرف کی یا وقت کی گرانمایہ دولت کو لہو و لعب کے کاموں کی نذر کر دیا اور دنیا سے اس طرح

رخصت ہوئے کہ ہمارا دامن حسن عمل سے خالی تھا۔

وقت کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے زمانہ کی جس میں وقت واقع ہوتا ہے قسم کھائی ہے اور علماء مفسرین نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شئے یا مقام کی قسم کھاتا ہے تو اس سے اس شئے یا مقام کو عظمت عطا کرنا اور اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے لہٰذا جب اللہ زمانہ کی قسم کھاتا ہے تو اس سے زمانہ اور وقت کی اہمیت سب سے زیادہ واضح بلکہ یقینی ہو جاتی ہے۔

والعصر — ان الانسان لفی خسر، الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

یعنی قسم ہے زمانہ کی، انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ انسان کی عمر اور اس کو عطا شدہ وقت کی دولت برف کی مانند ہے جو لمحہ بہ لمحہ برف کی طرح گھلتی جاتی ہے، الّا یہ کہ اس کے عوض کوئی متاع حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ ہم نے اگر اپنے وقت کا صحیح استعمال نہیں کیا تو مثال اس کی اس برف کی سی ہے جو ساری گھل کر بہہ گئی۔

وقت کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس بھی ثابت اور مسلم ہے۔ یہ انسان کی یہ طبعی اور فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے تمام کام وقت مقررہ پر انجام پذیر ہو جائیں۔ چنانچہ اگر ہمارے کام وقت پر پورے ہو جاتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی دلی مسرت ہوتی ہے۔ جس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں — اور بالفرض اگر وہ کام کسی وجہ سے وقت پر نہ ہو تو ذہنی انتشار اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، جو نہ صرف ہماری دماغی اور جسمانی صحت کو متاثر کرتا ہے بلکہ ہمارے نظام الاوقات اور نظام العمل کو بھی بحیثیت مجموعی متاثر کرتا ہے۔

بات نظام الاوقات کی آئی تو یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے دن کام کرنے کے لیئے اور رات میں آرام کرنے کے لیئے بنائیں ۔ اور پھر اس نظام الاوقات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو بھی داخل فرمایا چنانچہ علی الصبح اٹھنا، فجر کی نماز ادا کرنا اور پھر کام میں مشغول ہو جانا، زوال آفتاب کے بعد نماز ظہر ادا کرنا اور پھر تھوڑا سا آرام کر کے پھر کام میں مشغول ہو جانا اور پھر سہ پہر میں نماز عصر اور بعد غروب آفتاب نماز مغرب کے ساتھ دن کا تمام ہو جانا ۔ گویا اس سارے وقت میں وقفہ وقفہ — اللہ کے ذکر کے ساتھ کام میں مشغولیت —— یہ اسلام کی نظر میں محبوب و پسندیدہ ہے ۔

علاوہ ازیں، دنیا میں جو عظیم المرتبت شخصیتیں گزری ہیں اگر ہم ان کی زندگیوں کے حالات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو اگرچہ یہ شخصیتیں زندگی کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ایک بات ان سب میں مشترک نظر آئے گی اور وہ ہے وقت کی قدر و قیمت کا احساس اور اس کا صحیح استعمال —— دنیا میں جتنے بڑے کام ہوتے ہیں ۔ وہ سب وقت کی قدر و قیمت کے احساس اور اس کے صحیح استعمال کے سبب ہوتے ہیں مثل مشہور ہے کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔ اگر ہم وقت آنے پر اس کے ثمرات سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو وہ خوش بختی کسی دوسرے شخص کا مقدر ہو سکتی ہے ۔ اسی لئے ماہرین عمرانیات کا کہنا ہے کہ وقت زندگی کا سب سے سچا پیمانہ ہے وقت کی ترازو میں ہمارے تمام افعال اس وقت اثرات و نتائج کے اعتبار سے پورے اتریں گے ۔ جب ہم نے اس وقت کا جو ہمیں حاصل تھا، صحیح استعمال کیا ۔ اسی کا نام وقت کی قدر و قیمت ہے ۔

انسان کی زندگی فرائض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے ۔ ان فرائض سے ہم اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں ۔ جب ہم وقت کی قدر کریں اور اس کے صحیح استعمال کی طرف متوجہ رہیں ۔

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی

از

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ۔ پاکستان

شائع کردہ

صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازا ۔ نشتر روڈ کراچی